علاماتِ اہلسنّت

مؤلفہ:
امامِ اعظم ابُوحنیفہ نعمانؒ بِن ثابت رحمۃُ اللہ علیہ

تحقیق، ترتیب، ترجمہ و تشریح
مُفتی رشید احمد العلوی

علاماتِ اہلسنّت

(کتاب الوصیۃ)

مؤلفہ : امامِ اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ

ولادت : ۷۰ھ...... وفات : ۱۵۰ھ

روایت : امام حمّاد بن ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی

ولادت : ۱۰۰ھ...... وفات : ۱۷۶ھ

امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری

ولادت : ۱۱۳ھ وفات : ۱۸۰ھ

تحقیق ، ترتیب ، ترجمہ و تشریح

مُفتی رَشیدَ احمَد العَلوی

جمعیۃ پبلیکیشنز

رحمان پلازہ مچھلی منڈی اُردو بازار، لاہور فون : 042-7361339

Alamat e Ahl e Sunnat
By
Mufti Rasheed Ahmed Al alvi

ISBN: 978-969-8793-78-4

ضابطہ

نام کتاب	علامات اہل سنت
تالیف	مفتی رشید احمد العلوی
سالِ اشاعت	اگست ۲۰۰۸ء
ناشر	محمد ریاض درانی
کمپوزنگ	جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر، رحمٰن پلازہ اُردو بازار لاہور
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس، لاہور
قیمت	-/120 روپے

بہ اہتمام	محمد بلال درانی
قانونی مشیر	سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

فہرست

عرضِ ناشر

ہم ایک ارادہ لے کر اشاعتی سفر پہ نکلے تھے کہ ہم دین و دانش کے جواہر پارے خوبصورت طباعت کے ساتھ اہل علم ونظر کی خدمت میں پیش کریں گے۔ اللہ رب العزت کا بے حد وحساب شکر ہے کہ اُس نے ہمیں استقامت بخشی اور ہم اُس سفر پر صدق دل کے ساتھ گامزن ہیں اور مسلسل علمی شہ پارے پیش کررہے ہیں۔ بحمد للہ ہمارا سفر کہیں رُکا نہیں۔ حوصلہ کہیں ٹوٹا نہیں۔ ہمت ہمیشہ جواں رہی ہے۔ دل میں ہمیشہ جذبے موجزن رہے ہیں اور دماغ منصوبے سوچتا رہا ہے۔

ہمارا ادارہ صرف اشاعت کا کام ہی نہیں کرتا، یہ دراصل ایک تحقیقی ادارے کا کام بھی کرتا ہے۔ ہم بے سروساماں لوگ تحقیق کا بارِگراں کیسے اُٹھائیں۔ اس کے لیے ہم نہ کوئی لائبریری فراہم کرسکتے ہیں، نہ مستقل رفیق علمی ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ رب کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہمیں رفقائے علمی عطا کررکھے ہیں جو اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر تحقیق کرتے اور علم و دانش کے شہ پارے مرتب کرتے ہیں۔ پھر ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان شہپاروں کو شائع کریں۔ ہمارے رفقائے علمی میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ ہمارا کام ان کی تلاش ہے۔ ہم انھیں کام پر مائل کرتے اور مفید موضوعات پر کام کرنے پر قائل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بے بضاعتی کے باوجود کیسے کیسے بڑے کام شائع کرنے کی سعادت حاصل کرسکے ہیں۔ یہ سوچ کر دل شکر کے جذبوں سے بھر جاتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد علوی مدظلہ ہمارے نوجوان رفیق علمی ہیں۔ آپ ایک بڑے علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہونے کے علاوہ فخرِ خاندان بھی ہیں۔ آپ ایک مدت

سے حضرت امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ ان کی بعض کتابیں شائع بھی ہوئیں، مگر اکثر علمی حلقے ان کے کام سے بے خبر رہے۔ اب ہم نے ان کی تحقیقات کی اشاعت کا عزم کیا ہے۔ رب ذوالجلال اس عزم کو پختگی عطا کرے۔

قبل ازیں ہم نے ان کی تحقیق عشرین لابی حنیفہ شائع کی ہے۔ یہ کتاب یوں تو پہلے بھی چھپی، مگر یہ نشر مکرر کئی لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ ایک تو اس کا طباعتی معیار پہلے سے بہت بلند رہا ہے۔ دوسرے پروفیسر امجد علی شاکر کے تحقیقی مضمون نے حضرت امام ابوحنیفہ کو بطور محدث کے متعارف کروا کر اس کی افادیت کو بڑھا دیا ہے۔ انھوں نے سادہ و آسان لفظوں میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ از دل خیزد بر دل ریزد کی مثال ہو گیا ہے۔

زیر نظر کتاب حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی دو وصایا کا ترجمہ و تشریح ہے۔ یہ بھی حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی علمی کاوش ہے۔ اس کتاب پر بھی ہمارے محترم پروفیسر امجد علی شاکر نے ایک مفید مضمون قلمبند کیا ہے جو بطور پیش لفظ پیش خدمت ہے۔ اُمید ہے یہ پیش لفظ بیش از پیش مفید رہے گا۔

ہمارا عزم راسخ ہے کہ حضرت مفتی رشید احمد العلوی کے علمی جواہر پارے شائع کرتے رہیں۔ اس سلسلے میں فی الحال ہمارے مدنظر حضرت امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ارشاد علمیہ پر مفتی صاحب کی تحقیقات ہیں، ان شاء اللہ بہت سا تحقیقی کام منتظر اشاعت ہے جو جلد شائع ہوگا اور قارئین کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے اور ان کاوشوں کو قبول فرمائیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

محمد ریاض درانی

حرفِ چند

حامداً و مصلیا و تسلیماً.

ہمارا تو خیر عہد ہی تخصص کا ہے۔ ایک بندہ اپنے مضمون سے باہر جھانکنے کی کم ہی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت لطیفے مشہور ہیں کہ ایک ڈاکٹر دائیں کان کا ماہر ہوتا ہے اور بائیں کان سے بے خبر نکلتا ہے۔ قدیم عہد میں بھی ایسے بزرگ مل جاتے ہیں جو کسی ایک مضمون میں ماہر، بلکہ امام تھے، مگر دوسرے مضمون میں اُس عظمت کو نہ پا سکے جو انھیں ان کے مخصوص مضمون میں حاصل تھی۔ ہمارے عظیم محدث حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کو فن حدیث میں جو ممتاز مقام و مرتبہ حاصل ہے، وہ کسی سے پنہاں نہیں۔ ان کی تالیف صحیح بخاری کو اُمت میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ تسلیم کیا جاتا ہے، مگر ان کی فقہ کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔ اگرچہ ان کی صحیح ان کے محدث ہونے کی گواہی دینے کے علاوہ ان کی فقاہت کی امین بھی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہ نام جن کا نعمان اور کنیت ابوحنیفہ تھی، اُمت میں امام اعظم، امام الائمہ، سراج الامۃ اور ایسے ہی برگزید القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی عظمت کی ایک بڑی وجہ ان کے ایک سے زیادہ شعبوں میں ان کا کام ہے اور ان کا ہر کام کارنامہ ہے۔ آپ حدیث، فقہ، کلام اور تصوف چاروں علوم میں برگزیدہ بھی تھے اور خدا رسیدہ بھی۔ آپ ان سب شعبوں میں صاحب الرائے بھی تھے اور صائب الرائے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے تمام اُمت کو ان کا عیال قرار دیا ہے۔

حضرت امام کی عظمت کو جاننے کے لیے ایک اصول شروع میں سمجھ لینا ضروری ہے

کہ جینیس پیدائشی جینیس ہوتا ہے، اس لیے بعض اکابر کو پانچ برس کی عمر میں صحابیت حاصل ہوئی۔ ایسے ہی آپ بھی جینیس تھے اور آپ کو بچپن سے جوانی تک صحابہ کرام کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس امر میں تمام علمائے اُمت کا اتفاق ہے کہ آپ کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زیارت نصیب ہوئی اور بار بار نصیب ہوئی۔ اہل علم کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ آپ کو صحابہ کی رویت کے ساتھ ساتھ ان سے روایت بھی حاصل ہوئی۔ ہمارے دوست مولانا مفتی رشید احمد العلوی نے بیس احادیث بعنوان عشرین لابی حنیفہ مرتب کر کے اُمت پر احسان فرمایا۔ یہ وہ بیس احادیث ہیں جو حضرت الامام نے براہِ راست صحابہ کبار کی زبانوں سے سنیں۔

صحابہ کرام کے فیض صحبت سے حضرت الامام نے للٰہیت، خشیت، خدا پرستی، انسان دوستی اور سوزِ دروں حاصل کیے۔ جس کا نتیجہ تھا کہ آپ اپنے رب کے سامنے استغفار کرنے والے، اس کی تمحید و تسبیح کرنے والے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کی نذر پیش کرنے والے، انسانوں پر شفقت کرنے والے اور شاگردوں پر بے پناہ مہربان تھے۔ ایک قول تو مفتی رشید احمد صاحب نے اپنے مقدمے میں نقل فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے شاگرد حضرت امام زفر نے فرمایا:

> ''میں بیس برس تک حضرت کی خدمت میں رہا۔ میں نے آپ سے بڑھ کر کسی کو نصیحت کرنے والا، شفقت کرنے والا نہیں پایا۔ آپ کی حالت یہ تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہت عاجزی کرنے والے تھے۔ سارا دن تعلیم و تعلم میں گزرتا یا لوگوں کو دین کے مسائل بتانے میں۔ علمی مجلس ختم ہوتی تو آپ مریضوں کی عیادت کے لیے جاتے یا کسی مرحوم کے جنازے میں شرکت کرتے۔ کسی مفلس کی غم خواری کرتے یا کسی عزیز کی صلہ رحمی یا کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے۔ جب رات چھا جاتی تو عبادت میں مصروف ہو جاتے یا تلاوت قرآن کرتے۔ آپ کا یہ معمول تمام عمر جاری رہا۔''

یہ تھا وہ عابد شب زندہ دار کا کردار جو آپ کو صحبت صحابہ سے نصیب ہوا۔ یہ تھا وہ زہد جو آپ کو تمام عمر میسر رہا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے آپ کے جود سخا کے بے شمار واقعات بیان کیے ہیں۔ طوالت کلام کے باعث یہاں قلم کو روکنا پڑتا ہے۔ آپ کا وجود اُس عہد کے محدثین کے لیے ایک مستقل ذریعہ آمدن تھا۔ آپ جب اپنے گھر کے لیے اناج خریدتے تو محدثین کوفہ کے گھر والوں کے لیے بھی اناج خریدتے۔ جب آپ گھر والوں کے لیے کپڑے خریدتے تو محدثین کوفہ کے لیے بھی ایسا کرتے۔ جب اپنے گھر والوں کے لیے پھل خریدتے تو محدثین کوفہ کے بچوں کے لیے بھی پھل خریدتے۔ یہ معمول بھی مستقل رہا۔

یہ ایک صوفی باصفا کا کردار ہے۔ یہاں شریعت وطریقت کے تمام بحر جمع ہو گئے ہیں۔ آپ ایک بڑے صوفی تھے اور بڑے بڑوں نے اس بات کو تسلیم کیا۔ حضرت مخدوم علی ہجویری نے تصوف پر اپنی کتاب کشف المحجوب میں آپ کا ذکر خیر بڑے احترام سے کیا ہے اور آپ کو اجل صوفیاء میں شمار کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کا ایک ایک لفظ تصوف کا خزینہ اور گنجینہ ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف دین حق کے اوامر دل کی محبت سے کرنے کا نام ہے اور دین حق کے نواہی کو مان کر معاصی سے نفور ہو جانے اور بچ جانے کا نام ہے۔ تصوف سراسر شریعت ہے اور شریعت اپنے باطن میں تصوف کو لیے ہوئے ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نور اللہ مرقدہ کا بیان ہے کہ ایک بار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رائے پور جا رہے تھے۔ راستے میں سہارنپور اُترے تو حضرت شیخ کے ہاں بھی چلے گئے۔ یہ اوقات ایسے تھے کہ بیرونی احباب کو صرف مصافحہ کرنے کی اجازت تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن بھی صرف مصافحہ کے لیے حاضر ہوئے اور کہا کہ جاتے ہوئے صرف مصافحہ کے لیے آیا ہوں۔ جاتے جاتے یہ سوال چھوڑے جا رہا ہوں کہ تصوف کیا ہے؟ واپسی پر جواب سنوں گا۔ حضرت شیخ الحدیث نے دوران مصافحہ ارشاد فرمایا کہ جواب ابھی لیتے جائیے۔ تصوف کی ابتدا انما الاعمال بالنیات ہے اور انتہا وہ کیفیت احسان ہے جس کا حدیث میں یوں جواب ملتا ہے فاعبد

ربک کانک تراہ وان لم تکن وانہ یراک۔ ''اپنے رب کی یوں عبادت کر جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔''

حضرت امام ابو حنیفہ نے بھی اپنے وصایا میں تصوف کو ایسا ہی سادہ اور سہل بنا دیا ہے۔ حضرت الامام نے پانچ لاکھ احادیث میں سے جن پانچ کا انتخاب فرمایا ہے، ان میں سے اوّل انما الاعمال بالنیات ہے اور بقیہ پانچوں حرام سے بچنے، مشتبہ اور لغو باتوں سے اجتناب اور انسانی حقوق کے بارے میں ہیں۔ ایک حدیث وہ ہے جس میں رسول پاک کا ارشاد گرامی ہے کہ انسانی جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ تندرست ہو تو سارا جسم تندرست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم اس کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے اور وہ انسان کا دل ہے۔

حضرت الامام نے اُوپر جو حدیث نقل کی ہے، اس کو سامنے رکھیے اور حضرت حسن بصری کے قول کو دیکھئے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ اعضاو جوارح کی نیکی سے دل کی نیکی ہزار درجہ برتر ہے۔ یہ قول مذکورہ بالا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے مستفید و مستنیر نظر آتا ہے۔ یہی وہ قول ہے جس پر تصوف کی پوری عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

حضرت الامام کی ان وصایا سے ایمان و عمل کی کئی روشنیاں پھوٹ رہی ہیں۔ ان کا ایک رُخ تصوف ہے تو دوسرا رُخ ہمیں علم کلام کے ابواب اُلٹتا نظر آتا ہے۔ ان وصایا میں صرف استدلال پر دعوت و نصیحت غالب ہے۔ اس لیے یہ وہ استدلال نہیں بنتا جس کے متعلق مولانا رومؒ نے کہا تھا:

گر باستدلال کارِ دیں بدے

فخر رازی راز دار دیں بدے

حضرت الامام کی یہ وصایا علم کلام کا ایک روشن باب بھی ہیں۔ حضرت الامام اس فن میں بھی امام تھے۔ حضرت نے ابتداء میں علم کلام سیکھا اور اس فن میں یہاں تک تبحر حاصل کیا کہ آپ خود فرماتے ہیں کہ آپ کی طرف لوگوں کی اُنگلیاں اُٹھتی تھیں۔ آپ نے اس علم

میں کمال حاصل کیا اور اہل بدعت سے مناظرے کیے۔ آپ کا زمانہ عقائد میں بحث ونظر کا زمانہ تھا۔ اس عہد میں عقائد اور اصول کے حوالے سے سوالات سامنے آ رہے تھے۔ ایمان اور تقدیر جیسے موضوعات اُس عہد کا مبحث بنے ہوئے تھے۔ اُس عہد میں قدریہ، جہمیہ، خوارج اور معتزلہ جیسے گروہ فکری نزاعات پیدا کر رہے تھے۔ حضرت الامام نے علم کلام میں، جسے فقہ اکبر بھی کہا جاتا تھا، رسوخ پیدا کیا اور اہل البدعۃ سے بحث ومناظرے میں دین حق کی تائید کی۔ آپ نے جہم بن صفوان کے سامنے ایمان کے متعلق جو گفتگو فرمائی، وہ ایمان کی حقیقت بیان کرنے کے لیے از حد جامع ہے۔ اس میں دلائل کا مرجع صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ علم کلام کا بنیادی مسئلہ ایمان اور اس کی حقیقت ہے، اس حوالے سے اس علم کی اہمیت متعین ہوتی ہے۔ حضرت الامام نے اس موضوع پر تصانیف املا کرائیں اور اُمت کی راہنمائی کی۔

حضرت الامام نے علم کلام میں بہت سے رسائل املا کروائے جن کی علماء نے تصدیق کی اور ان سے استفادہ کیا۔ علامہ طاش کبریٰ زادہ نے لکھا:

> ''امام اعظم نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا۔ الفقہ الاکبر اور العالم جیسی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ کتابیں امام اعظم کی نہیں، معتزلہ کی اُڑائی ہوئی بات ہے۔'' (مفتاح السعادہ جلد ٢ صفحہ: ٢٩ بحوالہ مولانا محمد علی کاندھلوی، صفحہ: ٢٣١)

علامہ بیاضی نے حضرت الامام کی کتب ''الفقہ الاکبر''، ''الفقہ الابسط''، ''العالم و المتعلم'' اور ''الوصیۃ'' کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی سند روایت بیان کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ امام ابومنصور ماتریدی نے ان کتابوں کو نصیر بن یحییٰ اور محمد بن مقاتل سے روایت کیا ہے۔

علم کلام کو بعض اکابر نے صرف دفاع کے طور پر لیا ہے۔ جیسا کہ امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں لکھا:

انما المقصود منه حفظ عقيدة اهل السنه وحرا استها عن

تشویش اهل البدعة (صفحہ:٦٦)

علم کلام سے مقصود صرف اہل بدعۃ سے اہل سنۃ کے عقیدہ کی حفاظت ہے۔حضرت الامام کی کتاب الوصیۃ کو دیکھیں تو ہمیں علم کلام کے سلبی پہلو کے ساتھ ساتھ اس کے ایجابی پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ہمیں علم کلام تصوف، تفسیر، حدیث اور فن دانشمندی تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔یوں علم کلام رد بدعت کے علاوہ ایک مستقل مفہوم کا حامل علم ٹھہرتا ہے اور مستقل افادیت کا حاصل علم قرار پاتا ہے۔حضرت امام نے اس علم کو اس حیثیت سے نہ لیا تھا کہ اس کا مقصد دوسروں کو چپ کرانا ہے، بلکہ انھوں نے اسے ازدیاد ایمان کے وسیلے کے طور پر اختیار کیا۔حضرت الامام کے وصایا ہمارے اس دعوے کی کاملاً تائید کرتے ہیں۔

حضرت الامام فقہ اکبر میں پہلے مصنف ہیں۔اس بات کی شہادت ہمیں عبدالقاہر بغدادی شافعی سے ملتی ہے۔آپ فرماتے ہیں:

"اول متكلمهم من الفقها وارباب المذاهب ابو حنيفه والشافعي، فان ابا حنيفه له كتاب فى الرد على القدريه سماه الفقه الاكبر وله رسالة املا ها فى نصرة قول اهل السنة ان الاسطاعة مع الفعل." (عبدالقاہر بغدادی، اصول الدین، صفحہ ۲۰۸)

ترجمہ: "فقہا اور ارباب مذہب میں سے پہلے متکلم ابو حنیفہ اور شافعی ہیں۔بے شک ابو حنیفہ نے قدریہ کے رد میں کتاب لکھی، اُس کا نام فقہ اکبر رکھا۔اس رسالے کو اُس نے املا کرایا اہل سنت کی تائید ونصرت میں کہ بے شک استطاعۃ فعل کے ساتھ ہے۔"

حضرت الامام کی کلامی کتابوں کی علماء نے بہت تحسین کی اور ان کا بہت اچھے لفظوں میں تذکرہ کیا۔علماء نے آپ کو علم کلام میں دوسروں سے سبقت لے جانے والا اور پہلا مصنف ٹھہرایا۔حضرت الامام کی اس فن میں عظمت ورفعت کے ثبوت کے لیے یہی کافی ہے کہ اہل سنت کے کلامی مذاہب (اشعریہ، ماتریدیہ) میں ایک مذہب کے بانی حضرت امام منصور ماتریدی رحمہ اللہ کو آپ کے سلسلے میں شرف تلمذ حاصل ہوا اور انھوں نے آپ سے

سندلی اور علم کلام آپ سے روایت کیا اور آپ کے مذہب کو تمام دنیا میں پھیلایا۔ ابن ندیم نے الفہرست میں آپ کی کتابوں کے تذکرے کے بعد یہ بات لکھی ہے:

العلم بحراً وبراً شرقاً وغرباً بعداً وقرباً

''دور، نزدیک، مشرق ومغرب اور خشکی وتری میں آپ ہی کا علم ہے۔''

(ابن الندیم، الفہرست، صفحہ: ۲۵۵)

کتاب الوصیہ حضرت الامام کے علم کلام کی امین اور آپ کی وسعت نظر کی شاہد ہے۔ حضرت الامام نے ان وصایا میں اہل تشیع یا خوارج، معتزلہ یا جہمیہ ہر غیر معتدل گروہ کا رد کیا ہے اور فتنوں کا در بند کیا ہے۔ آپ نے مشاجرات صحابہ میں سکوت اختیار کی ہے اور حب صحابہ کو اہل سنت کا مذہب ٹھہرایا ہے۔

اُمت میں فضیلت کا مسئلہ بھی بہت اہم مسئلہ رہا ہے۔ آپ نے اُمت میں افضل ترین شخص کے تعین کے سلسلے میں بہت واضح مؤقف اختیار کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اُمت میں افضل ترین شخص قرار دیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں جس قدر کھل کر بات کی ہے، شاید کوئی دوسرا نہ کر سکے:

نقربان عائشه رضى الله عنها وخديجة الكبرىٰ، افضل نساء العلمين وهن ام المومنين مطهرة عن الزنا وبريئةٌ عما وقالت الروافض، فمن شهد عليها بالزنا فهو ولد الزنا و كافرٌ.

لہجے کی یہ سختی حضرت الامام کے عمومی مزاج کا حصہ نہیں ہے، مگر یہاں اُن کے ہاں تلخی آ گئی ہے تو یہ بلاوجہ نہیں۔ یہاں حضرت عائشہ صدیقہ کا تقدس مدنظر تھا۔ یہاں حضرت عائشہ کی حرمت کی تصدیق وتائید ان کا موضوع تھا۔ اسی لیے آپ نے اتنے سخت لہجے میں اُن لوگوں کا رد کیا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت تراشتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حضرت الامام کے ہاں علم کلام فتنوں کا در بند کرنے اور عمل خیر کی راہ کھولنے کا ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ علم کلام کی تاریخ میں ذات وصفات باری، جبر وقدرت، قرآن مجید کا قدیم یا حادث ہونا، عذاب قبر، نامہ اعمال کا پڑھا جانا، زیارت الٰہی جیسے اُمہات مسائل میں

اُمت کے مختلف گروہ مدتوں بحث ونزاع کا شکار رہے ہیں۔ ان امور میں قول فیصل فقہاو محدثین اور اہل سنت کے آئمہ کے اقوال ہی ثابت ہوئے ہیں۔ حیرت ہے کہ علم کلام کے ان تمام امہات مسائل پر حضرت الامام نے جس انداز میں کلام فرمایا ہے، وہ علم کلام کی طویل عبارتوں کے مطالعے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ آپ نے مختصراً کلام اللہ سے اخذ کردہ چند مسائل بیان فرمادیے ہیں اوران مسائل کی گہرائی تک جا پہنچے ہیں۔

انسان کا اپنے فعل سے جو تعلق رہا ہے، یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ فلاسفہ و متکلمین نے اس پر بہت کچھ کہا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ:

ڈور کو سلجھا رہا ہوں اور سرا ملتا نہیں

معتزلہ نے قدرت کا دعویٰ کیا اور جبریہ نے جبر محض کا جبکہ آپ نے صحابہ کے مسلک پر گامزن رہتے ہوئے ارشاد فرمایا:

نُقِرُّبان الاستطاعه مع الفعل لاقبل الفعل ولا بعد الفعل

ہم اقرار کرتے ہیں کہ انسان استطاعت اُس کے فعل کے ساتھ ہے۔ نہ پہلے نہ بعد۔ یہ وہ قول فیصل ہے جہاں اشاعرہ کا نظریہ کسب نہ پہنچ سکا۔ معتزلہ کی جادۂ اعتدال سے محرومی تو راہ پر کیوں کر لا سکتی ہے۔

حضرت الامام ذات وصفاتِ باری کے بارے میں بہت واضح ہیں۔ اسی لیے اس سے متفرع ہونے والے مسائل میں حضرت ہر طرح واضح ہیں اور ایسی بات کہتے ہیں کہ کہیں اُلجھن باقی نہیں رہتی۔ ذات وصفات باری اور قرآن مجید کے کلام یا مخلوق ہونے کے مسئلے پر بھی آپ جادۂ شریعت پر سختی سے قائم ہیں اور کہیں حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہوئے۔ ان موضوعات پر اہل سنت کے دوسرے علماء نے بہت سے بحث مباحثوں کے بعد جو بات کہی، وہ وہی ہے جو حضرت الامام کہہ چکے ہیں۔

ہمارے عہد میں فکری دنیا میں جس قدر نزاعات ہیں، اُن کی ابتدا مستشرقین کے ہاں سے ہو رہی ہے۔ بہت سے اہل علم ان سے متاثر ہوئے اور بے خبری میں انھی کے افکار کی

اشاعت کا باعث بن گئی۔ علم حدیث کے بارے میں بہت سے افسانے انھی کی تحقیق سے شروع ہوئے۔ انھی کی جہالتوں نے سنت کے موضوع پر مناقشے برپا کیے۔ یوں تو مستشرقین کی سائنسی تحقیق کی بہت دھوم رہی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحقیق کی بنا ہی غلط ہے۔ ان کی بنائے تحقیق ان دو مفروضوں پر استوار ہے:

۱- تمام تہذیبیں مردہ ہیں اور صرف تہذیب مغرب ہی زندہ تہذیب ہے۔

۲- تمام مذاہب (معاذ اللہ) جعلی ہیں اور ان کے پیروکار (معاذ اللہ) غلط بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ان غلط مفروضوں پر استوار تحقیق کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی تحقیق بناء الفاسد علی الفاسد کا خوفناک نمونہ بن جاتی ہے۔

حدیث کے متعلق مستشرق گولڈ زیہر نے اپنی تحقیق (جسے تکذیب کہنا درست ہوگا) سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حدیث کے وسیع ذخیرے سے ایسا حصہ قدرے اعتماد کے ساتھ چھانٹ کر الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے جس کا تعلق مستند طور پر یا تو پیغمبر کے ساتھ یا ان کے صحابہ کی اوّلین نسل کے ساتھ قائم کیا جا سکے۔ اس کے باوجود گولڈ زیہر نے یہ تسلیم کیا کہ حدیث کا مظہر اسلام کے ابتدائی زمانوں تک جاتا ہے، حتیٰ کہ انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ممکن ہے پیغمبرؐ کے زمانے میں حدیث کا کوئی غیر رسمی ریکارڈ موجود ہو

اِستشراق سے تاثر پذیری کا نتیجہ ہمیشہ خطرناک رہا ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیے کہ علامہ اقبال نے خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں فرماتے ہیں:

> Among their modern critics professor Gold Ziher has subjected them to a searching examination in the light of modern historical criticizm and arrives at the conclusion that they (hedith) are on the whole untrustworthy.
> (Page: 135)

گولڈ زیہر کے بعد جوزف شاخت نے حدیث کے متعلق انتہائی زہریلا تبصرہ کیا۔

اُس نے اپنی کتاب An Introduction to Islamic Law میں لکھا:

''جہاں تک مذہبی قانون (فقہ) کا تعلق ہے، اُس کے بارے میں شاید ہی کسی حدیث کو قابل اعتماد قرار دیا جاسکے۔'' (صفحہ:۳۴)

شاخت کا نظریہ دیکھئے اور حضرت امام ابو حنیفہ کے مخالفین کے اعتراضات یاد کیجیے۔ کیا یہ سارے اعتراضات شاخت ہی کے نظریات کی صدائے بازگشت ہی تو نہیں ہیں۔ شاخت کا نظریہ ہے:

''یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کے ساتھ ساتھ فقہا کے تمام طبقات نے حدیث کی سختی سے مخالفت کی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ حدیث ان کی فقہ میں زیادہ مؤثر اور دخیل عنصر نہ بن سکے۔''

(Origins of Muhammaden Jurispridence, Page 57)

کچھ ایسی ہی بات شاخت سے بہت پہلے علامہ اقبال بھی کہہ چکے ہیں۔ اسے بھی دیکھ لیجیے:

"The School of Abu Hanifah seem to have found on the whole, Littrer or no guidance from the precedeuts recorded in the literature of traditions. The only alternative cfer to them was to resort to speculative reason to thier interpretations. (as cited above, Page 140)

ترجمہ: ''امام ابو حنیفہ نے اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔'' (علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

اب اس کے ساتھ ساتھ وہ افسانہ بھی یاد رہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ کو سترہ احادیث

یاد تھیں۔ یہ حوالہ جن بزرگ سے منقول ہے، انھوں نے جہلاء کا یہ قول بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کی ہے، مگر جہلا کا قول جہلاء کو کچھ ایسا پسند آ گیا ہے کہ یہ ان کے لیے سند ہو کر رہ گیا ہے۔ ان تمام باتوں کو ایک تسلسل میں دیکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے متعلق یہودی مستشرقین یہ بات ثابت کر رہے تھے کہ ان کے دور تک حدیث کا وجود نہیں تھا اور انھوں نے تدوین فقہ میں حدیث سے استفادہ نہیں کیا۔ ان کا مقصد حدیث کو زمانہ مابعد کا فینامنا ثابت کرنا تھا۔ حضرت الامام عہد صحابہ سے قریب تر ہونے کے سبب مستشرقین کے خصوصی التفات کا باعث تھے کہ ان کے دور تک حدیث کا وجود مجہول الاصل ثابت کیا جائے تو حدیث کا وجود خود بخود مشکوک ہو جاتا ہے اور زمانہ مابعد کا ساختہ پرداختہ ٹھہرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث رسول اکرم و اعظمؐ سے مسلسل آگے بڑھی اور فقہائے کوفہ و مدینہ نے حدیث سے خصوصی التفات کیا۔ ان کے عہد میں (جو عہد صحابہ سے متصل تھا) حدیث کا وجود چار سو خوشبو کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ کوئی فقیہ یا عالم حدیث سے غیر متعلق ہو کر عوام میں نہ معتبر ہو سکتا تھا، نہ اُس کی فقہ مقبول و محبوب ہو سکتی تھی۔ حضرت امام ابوحنیفہ کو حدیث سے غافل ثابت کرنا یا ان کی فقہ کو حدیث سے غیر متعلق ثابت کرنا دراصل اس مقصد کے لیے تھا کہ حدیث کے تمام ذخیرے کو ہی غیر معتبر ثابت کیا جا سکے۔

حضرت الامام نے اپنی فقہ میں حدیث کو غایت درجہ اہمیت دی ہے۔ آپ اپنی فقہ میں حدیث رسول میں موجود اشارات تک سے مسائل مستنبط کرتے اور حدیث میں پوشیدہ غوامض سے قوانین اخذ کرتے۔ اس سلسلے میں راقم نے اپنے مضمون ''حضرت امام ابوحنیفہ بطور محدث'' میں چند باتیں عرض کی ہیں۔ یہاں آپ کی علم حدیث میں وسعت اور تبحر کے بارے میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

حضرت الامام نے اپنے صاحبزادے کو جو وصیت فرمائی اس میں انیسویں بات یوں شروع فرماتے ہیں:

ان پانچ احادیث پر ضرور عمل کیا کرنا، جن کو میں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے چنا

ہے الخ۔

حضرت مفتی رشید احمد العلوی نے اپنے مقدمے میں اس جملے پر قدرے روشنی ڈالی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کے علم حدیث میں وسعت علم اور بلاغت نظر کی تائید کے لیے یہی حدیث کافی ہے۔ اہل نظر پر یہ بات عیاں ہے کہ حضرت کے زمانے میں محدثین حدیث سن کر لکھنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ وہ حدیث یاد کرتے تھے اور تحریر کو بطور بیاض کے استعمال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورِ اقدس واعظم کے قریبی زمانے میں حدیث کے بہت کم تحریری ذخیرے دریافت ہو سکے ہیں۔ حضرت امام کا پانچ لاکھ احادیث جاننے کا مفہوم یہ تھا کہ آپ کو پانچ لاکھ احادیث زبانی یاد تھیں۔

حضرت الامام بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ایسے ۲۶ حفاظ حدیث کا تذکرہ کیا ہے جو حدیث میں آپ کے مشائخ تھے۔ حافظ ذہبی نے آپ کا ذکر خیر بھی حفاظِ حدیث میں کیا ہے۔ واضح رہے کہ ان کا معیار بہت کڑا تھا۔ انھوں نے ایسے حافظانِ حدیث کا ذکر کرنا گوارا نہیں کیا جنھیں وہ متروک یا غیر ثقہ خیال کرتے تھے۔ امام ذہبی حضرت 'لامام کو نہ صرف ثقہ حافظ حدیث خیال کرتے تھے، انھیں معدلین میں بھی شمار کرتے تھے۔ حافظ ذہبی کسی محدث کی ثقاہت کے لیے حضرت امام کے قول کو سند سمجھتے۔ ایک جگہ حضرت الامام کا قول نقل فرماتے ہیں:

عن ابی حنیفه مارأیت افقه من جعفر بن محمد

امام ذہبی نے تذکرۂ حفاظ میں کسی قلیل الحدیث بزرگ کا تذکرہ نہیں کیا۔ خارجہ بن زید کو ذہبی نے قلیل الحدیث خیال کرتے ہوئے ان کا تذکرہ کرنا گوارا نہیں کیا، حالانکہ وہ فقہائے سبعہ میں شامل ہیں اور ابن سعد نے طبقات میں انھیں یہ کہہ کر خراج تحسین پیش کیا ہے کہ کان ثقة کثیر الحدیث۔ ذہبی انھیں قلیل الحدیث خیال کرتے تھے اس لیے ان کے تذکرے سے گریز کیا ہے۔ یہی ذہبی حضرت امام کا تذکرہ کرتے ہیں تو یہ بات ثابت

ہو جاتی ہے کہ

(۱) آپ کثیر الروایت حافظ حدیث تھے۔

(۲) آپ ثقہ تھے، معدل تھے اور کسی حوالے سے بھی متروک نہیں تھے۔

حضرت امام اعظم کے حدیث میں آثارِ علمیہ میں کتاب الآثار بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ وہ مجموعہ حدیث ہے جسے حضرت الامام نے چالیس ہزار احادیث سے انتخاب فرمایا۔ یہاں ضمناً یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ امام بخاری کے چھ لاکھ احادیث سے انتخاب کا سبب یہ ہے کہ امام بخاری زمانہ مابعد کے بزرگ ہیں۔ ان تک پہنچتے پہنچتے احادیث کے اسناد اور طرقِ اسناد میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ اس لیے انھیں زیادہ احادیث سے انتخاب کرنا پڑا۔ ایک ہی حدیث کا متن ایک سے زیادہ سندات کے ذریعے روایت ہو تو اتنی ہی احادیث شمار ہوتی ہیں جتنی سندات۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ چالیس ہزار احادیث میں متن کے لحاظ سے اتنی ہی حدیثیں موجود ہوں جتنی دو لاکھ یا اس سے زیادہ احادیث ہیں۔ کتاب الآثار کی علمی اہمیت اور فضیلت کا ایک حوالہ قاضی ابوالعباس نے اپنی کتاب اخبار ابی حنیفہ میں نقل کیا ہے:

امام مالک امام ابو حنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور اس سے نفع اندوز ہوتے تھے۔ (بحوالہ محمد علی صدیقی کاندھلوی، امام اعظم اور علم حدیث، صفحہ: ۴۳۸)

مولانا محمد علی صدیقی یہاں ایک عجیب نکتہ بیان کرتے ہیں:

''شاہ عبدالعزیز لکھ رہے ہیں کہ موطا کا درجہ صحیحین کے لیے بمنزلہ ماں کے ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ اس لحاظ سے کتاب الآثار کا مقام بھی موطا امام مالک کے لیے یہی ہے۔ یعنی جو نسبت بخاری و مسلم کی کتابوں کو موطا امام مالک سے ہے، وہی نسبت موطا کو کتاب الآثار سے بھی ہے۔'' (حوالہ مذکور، صفحہ: ۴۳۹)

حضرت امام ابو حنیفہ بطور محدث جس قدر وسعتِ علم کے حامل تھے، اس کے تذکرے

کے لیے تو دفتر درکار ہے۔ بہر حال یہاں گفتگو مختصر کیا جاتا ہے۔

حضرت امام کی اُمت میں جو حیثیت سب سے زیادہ ممتاز رہی، وہ فقیہ کی ہے۔ آپ فقہائے اربعہ میں زمانی اعتبار سے بھی اقدم ہیں، علمی اعتبار سے بھی۔ حضرت امام شافعی نے فرمایا کہ تمام دنیا علم میں امام ابوحنیفہ کی عیال ہے۔ امام شافعی علیہ الرحمہ ایک واسطے سے حضرت امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے اور امام احمد بن حنبل آپ کے شاگرد۔ گویا فقہائے اربعہ میں سے دو آپ کے ہی سلسلہ تلمذ سے منسلک تھے اور علمی اعتبار سے آپ کے فیضان سے مستفید ہوئے تھے۔

فقہ دین کے بنیادی علوم میں سے ہے۔ فقیہ نبوت کے مراد تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اس طرح دین کی حفاظت اور اشاعت میں محنت صرف کرتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ فقہ کو دین کے بنیادی علوم میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”فقہاء کے انداز پر حدیث سے مسئلہ نکالنا اور الفاظ حدیث کا تتبع و تلاش دونوں کی دین میں بنیادی حیثیت ہے۔“ (حجۃ اللہ البالغہ، صفحہ: ۵۹)

فقہاء میں جو لوگ درجہ اجتہاد پر فائز ہوئے، انھیں حد درجہ بصیرت اور ذکا حاصل تھا۔ مجتہد کے لیے جن صفات کا ہونا امر لازم ہے، اُن کے بارے میں شاطبی لکھتے ہیں:

> ”درجہ اجتہاد صرف اُس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو دو صفتوں سے موصوف ہو۔ ایک یہ کہ پوری کی پوری شریعت کے مقاصد کو سمجھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ مسائل نکالنے کی قدرت رکھتا ہو۔“
>
> (الموافقات جلد ۱، صفحہ: ۲۴)

حضرت الامام ان صفات سے موصوف بھی تھے اور ان صفات میں آپ اپنی نظیر تھے۔ حضرت الامام نے قرآن و سنت کو سامنے رکھ کر مسائل فقہ کا استنباط کیا جنھیں ایک مجلس علمی میں زیر بحث لایا جاتا۔ اس مجلس علمی میں چالیس فقہا کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ حضرت امام محمد اس مجلس فقہی کے سیکرٹری تھے اور اس کے فیصلے قلمبند کرتے تھے۔ اسی لیے کہا

جاتا ہے کہ حضرت الامام اپنے شاگرد حضرت امام محمد کے محسن تو تھے ہی، امام محمد بھی اپنے اُستاد کے محسن تھے کہ انھوں نے اپنے اُستاد کی فقہ کی تدوین کی اور اسے آنے والے زمانے کے لوگوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ حضرت الامام کی فقہ کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ آپ محدثین کے مقابل اہل الرائے تھے اور آپ کی فقہ کی بناء قیاس پر ہے۔ اس غلط فہمی کے بارے میں پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو حضرت امام شاہ ولی اللہ نے ارشاد فرمائی:

''مسند ابی حنیفہ و آثار محمد بنائے فقہ حنفیہ است'' (مصفی جلد ۱، صفحہ: ۱۳)

(حضرت الامام کے نزدیک عمل بالحدیث اور دوسری رایوں اور فتووں پر اس کی ترجیح کے لیے دیکھیے انتقاد ابن عبدالبر، موطا امام محمد و آثار امام محمد)

حضرت امام ابو حنیفہ قرآن و سنت کو مرجع و ماخذ بناتے اور مقاصد نبوت کی تلاش کرتے ہیں۔ آپ پر جہاں ایک الزام یہ ہے کہ آپ حدیث سے استفادہ نہیں کرتے، وہیں دوسرا الزام یہ بھی ہے کہ آپ ضعیف حدیث سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ضعیف حدیث سے استفادے کے متعلق بحث کا یہ محل نہیں، مگر یہ بات کہے بغیر چارہ نہیں کہ آپ صاحب فن تھے اور صاحب فن کمزور ماخذ سے بھی درست نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ صاحب فن کمزور سند کی حامل ایسی حدیث سے استفادہ کر سکتا ہے جس کا متن اعلیٰ درجے کا ہو۔ وہ دین کے مجموعی مزاج و معیار کے مطابق ہو۔ متواتر حدیث یا قرآن مجید کی کوئی نص سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ بہر حال یہ موضوع فی الحال تشنہ چھوڑتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔

حضرت الامام نے اعمال کو فرائض فضائل اور نواہی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں ہر ایک کی توضیح کرتے ہوئے مسائل اخذ کیے ہیں۔ آپ کا عمومی مزاج فقیہ کا تھا یا متکلم کا۔ اس لیے یہ مزاج آپ کی اس تحریر میں بھی جلوہ گر ہے۔

حضرت الامام علم تفسیر میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے۔ انھوں نے باقاعدہ اور باضابطہ تفسیر تو نہیں لکھی، مگر ان کے تفسیری اقوال کو جمع کیا جائے تو علم تفسیر میں نکات علمیہ کا ذخیرہ جمع ہو

سکتا ہے۔ ان نکات کو علم تفسیر میں یقیناً بلند درجہ حاصل ہوگا۔ زیر نظر کتاب میں بھی حضرت کے تفسیری افادات موجود ہیں اور نکات علمیہ کا ایک خزینہ موجود ہے۔ ان نکات سے ہم بہت سی پیچیدہ گتھیاں سلجھا سکتے ہیں اور بہت سے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ بطور نمونہ ایک آیت کی تفسیر دیکھئے اور حضرت الامام کی دقت نگاہ کی داد دیجیے، آیت ہے:

یا ایھا الناس اتقوا ربکم

اس کی تفسیر میں حضرت الامام لکھتے ہیں:

معناہ یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و ایھا الکافرون آمنوا باللہ و ایھا المنافقون اخلصوا باللہ.

اس کے معنی ہیں ”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اے کافرو! ایمان لاؤ اور اے منافقو! اللہ سے اخلاص اختیار کرو۔“

اس تفسیری افادے کو دیکھئے تو یہ مفہوم ہر لحاظ سے جامع ہے۔ اس آیت میں حکم تمام انسانوں کے لیے ہے اور حکم تقویٰ اختیار کرنے کا ہے۔ اب ظاہر ہے ہر انسان پر اس کا اطلاق اُس کے حال کے موافق ہوگا۔

نماز قصر اور افطار کے متعلق حضرت الامام نے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ یہ رخصت ہے۔ اُن کا یہ استنباط بھی براہ راست قرآن مجید سے ہے۔ چنانچہ آپ ارشاد کرتے ہیں:

”سفر کے دوران نماز میں قصر کرنے اور روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور اس کی دلیل قرآن کریم میں ہے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”واذ اخرتم فی الارض فلیس علیکم جناحٌ ان تقصروا من الصلوٰۃ“۔

رخصت کا یہ مسلک ہی بہت سی اُلجھنوں سے بچا سکتا ہے اور یہی حضرت الامام کا مذہب ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت الامام نے اپنے اقوال کی تائید قرآن مجید سے پیش کی ہے، بلکہ درست امر یہ ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں اپنے اقوال پیش کیے ہیں۔ انھوں نے ہر

جگہ قرآن حکیم کی آیات بینات کو مدنظر رکھا ہے اور انھی سے رہبری حاصل کی ہے۔ حضرت الامام کی قرآن فہمی اُن کی فقہ میں، اُن کے علم کلام میں اور ان کے علم حدیث میں عام نظر آتی ہے۔ ان کی قرآن فہمی کا مظہر یہ وصایا بھی ہیں۔ ان میں کئی تفسیری نکات و لطائف ملتے ہیں۔

حضرت الامام کا ایک شعبہ علم دانشمندی بھی تھا۔ آپ نے زندگی کے بہت سے شعبوں میں کئی تجربات کیے تھے۔ آپ تاجر تھے، عالم تھے، محدث تھے، مفسر تھے، صوفی تھے۔ زاہد شب زندہ دار تھے، حکومت کے معتوب تھے، عوام کے محبوب تھے۔ اہل علم میں مقبول تھے۔ ایک زمانے میں آپ نے قضاۃ کا منصب قبول کرنے سے انکار کیا تو آپ کو اینٹیں گننے پر لگا دیا گیا۔ آپ نے وہاں بھی اپنی جودت طبع اور اپج کا مظاہرہ کیا اور اینٹیں اس طریقے سے گنیں کہ سول انجینئرنگ کو ایک نئی راہ دکھا دی۔ آپ نے اس وصایا میں بھی دانشمندی کے کئی باب کھولے ہیں اور جینے کے بعض احسن طریقے منکشف کیے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے، یہ مثالیں دوسری وصیت سے لی گئی ہیں جو آپ نے اپنے صاحبزادے حماد علیہ الرحمہ کو ارشاد فرمائیں:

☆ زندگی میں کسی بھی وقت جس چیز کے جاننے کی ضرورت پیش آ سکتی ہو، اس کے جاننے سے ہرگز جاہل نہ رہنا، بلکہ اس کے جاننے کی فکر کرتے رہنا، تاوقتیکہ وہ تمہارے علم میں آ جائے۔

☆ کسی ایسے آدمی کے ساتھ جس سے دین و دنیا کا فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو، اُس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات نہ رکھنا۔

☆ اپنے آپ کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا کرنا اور کسی دوسرے سے انصاف کا مطالبہ نہ کرنا۔ ہاں جب سخت ضرورت ہو، انصاف کا مطالبہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ تیری مدد کرے گا۔

☆ یہ ہے کہ زندگی میں کسی مسلمان یا کسی ذمی سے دشمنی نہ اختیار کرنا۔

آخری بات پڑھ کر عارفِ شیراز یاد آئے:

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

حضرت الامام نے دانشمندی کے ایسے ایسے نکات بیان کیے ہیں کہ بندہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کاش یہ باتیں اب سے پہلے معلوم ہوتیں۔

حضرت الامام نے ان وصایا میں خصوصاً وصیت اوّل میں استدلال کا خوبصورت انداز اپنایا ہے۔ آپ ہر بات کے لیے دلیل لاتے ہیں۔ آپ نے اپنے اقوال کو دلائل قرآنی سے مزین فرمایا ہے اور کہیں کوئی بات بغیر دلیل کے نہیں کہی۔ عموماً علماء کا انداز بیان دوسروں سے مختلف بھی ہوتا ہے اور منفرد بھی۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آیا۔

مولانا برکات احمد ٹونکی کے ہاں مولانا معین الدین اجمیری اور مولانا فضل خیرآبادی کے خاندان کے چشم و چراغ حکیم ظفر الحق پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز دونوں میں تکرار تلخ کلامی تک جا پہنچی۔ مولانا معین الدین اجمیری نے تلخی میں ایک عجیب جملہ کہا:

"مجھ جیسا فخر خاندان کوئی کیا ہوگا اور تم سا ننگ خاندان کون ہوگا۔ دلیل اس دعوے کی یہ ہے کہ میرے آباء میں کوئی عالم تو کیا ہوتا حرف شناس بھی نہ ہوا ہوگا۔ رہے تم تو تم سا کم سواد تمہارے خاندان میں کون ہوگا۔"

یہ لطیفہ صرف اس لیے عرض کیا کہ سمجھا جا سکے اہل علم کا مزاج کیا ہوتا ہے۔ وہ تلخ کلامی میں بھی دلیل لانا نہیں بھولتے۔ یہ واقعہ تو زیادہ پرانا نہیں، متقدم دور کے علماء کا مزاج اور ان میں بھی حضرت امام اعظمؒ جیسی عظیم ہستی کا مزاج تو یقیناً ایسا تھا کہ دلیل یا شہادت کے بغیر کوئی بات نہ کرتے۔ ہماری تہذیب کی بنیاد شہادت پر ہے اور تہذیب مغرب کی بنا صرف دلیل پر۔ حضرت الامام نے شہادت اور استدلال کو یکجا کر کے اپنی بات کو مستند کیا ہے۔

ایک آخری بات حضرت کے انداز بیان کے بارے میں۔ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا

اُوتیت جوامع الکلم

اس کی توضیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رب کائنات نے یہ صلاحیت عطا کی تھی کہ آپ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہہ سکیں۔ اس قول میں بھی ایک دلیل پوشیدہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ یہی بات اس سے کم حروف میں کوئی کہہ نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ادب اعلیٰ کا معیار ہے کہ کہنے والا اتنے لفظوں میں بات کہے کہ اس سے کم لفظوں میں کہی نہ جاسکے۔ کہتے ہیں:

خیر الکلام ماقل ودلّ

''بہترین کلام وہ ہے جو قلیل ہو (لفظوں کے اعتبار سے) اور مدلل ہو (مفہوم کے اعتبار سے)''

حضرت الامام کی وصایا کو دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ آپ آنحضور کی جوامع الکلم ہونے کی صفت سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ کلام مختصر بھی ہے، مدلل بھی اور معانی کی وسعتوں کا حامل بھی۔ چند جملے دیکھئے:

والکسب بالعمل حلالٌ وجمع المال حلال وجمع المال من الحرام حرامٌ

ان تقنع من اللہ بما رزقک من مال اوجاہ ان تقمع نفسک من الخوضِ فی الفضول

ان جملوں میں لفظوں کی قلت اور معانی کی کثرت پر توجہ کیجیے اور پھر لفظوں کی فصاحت اور معانی کی بلاغت پر نظر کیجیے۔ یہ جملے سحر حلال نظر آئیں گے۔ یہی ادب اور ادیب کا کمال ہے۔

اس قدر درازنفسی کے باوجود یہ احساس ہورہا ہے کہ اس تحریر کے بارے میں بہت کم کہا جاسکا ہے۔ میرے کوتاہ علم کو بھی دفتر کا دامن تنگ نظر آتا ہے تو یہ حضرت الامام کی تحریر کا کمال ہی ہے:

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

آخر میں چند باتیں محقق اور مترجم کی تحقیق کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا۔ انھوں نے تحقیق سے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ حضرت الامام کی پیدائش کے بارے میں تین روایات ہیں۔ ۶۰ ہجری، ۷۰ ہجری اور ۸۰ ہجری کی روایات۔ اُردو تصانیف میں مؤخر الذکر روایت کو قبول عام حاصل ہوا ہے۔ مولانا مفتی رشید احمد نے ۷۰ ہجری کی روایت کو قبول کیا ہے۔

۲۔ حضرت امام ابو یوسف کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کی پیدائش کا سن تو معلوم ہے، مگر وفات کا سن معلوم نہیں۔

۳۔ حضرت حماد رحمہ اللہ کی وفات کا سن معلوم ہے، مگر اُن کی پیدائش کا سال معلوم نہیں۔

۴۔ حضرت مفتی صاحب نے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا ہے کہ حضرت الامام حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ حضرت الامام حضرت امام جعفر صادقؒ کے والد گرامی قدر حضرت امام باقرؒ کے شاگرد رشید تھے۔

یہ چند باتیں بتوفیق الٰہی عرض کر دی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ غلطیوں سے درگزر کریں اور اگر کوئی کوتاہی اصلاح طلب ہو تو آگاہ فرمائیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

امجد علی شاکر

۲۴ رجب ۱۴۲۹ھ

مقدمہ

الحمدُ للّٰہ الّذی ھدٰانا لھٰذا وما کنّا لنھتدی لولا ان ھدٰانا اللّٰہ ؛ وصلی اللّٰہ و بارک وسلّم علیٰ رسول اللّٰہ الّذی لانبیّ بعدہ ولارسُول بعد رسالتہ؛ورحم اللّٰہ علی مَن آمن وعمِل صالحاً ؛ ولم یعمَل بہ وحزن علیہ؛ وبارک اللّٰہ الفَ الفَ مرّاۃٍ علی اساطِین الامّۃ وجھابذتِہ؛ الیٰ یومِ الدّین بِرحمتک یا ارحمَ الرّاحمین ؛ آمین!

کسی انسان کونصیحت کرنا آسان کام نہیں ہے ،اس لئے کہ اگرنصیحت کنندہ کواس نصیحت سے فائدہ ہوجائے تووہ اس کواپنی خوبی اوردانشمندی خیال کرتا ہے،اوراگراس کواس نصیحت پرعمل کرنے کے بعدناکامی کا منہ دیکھنا پڑے یا اس نصیحت کے بدلے میں اسکانقصان ہوجائے توساری الابلاناصح کی گردن پرڈال دی جاتی ہے۔اس کوطرح طرح کے القابات سے نوازاجاتا ہے۔اس کے باوجودنصیحت کرنے سے نہ کوئی باز آیااورنہ کوئی باز آئے گا، بلکہ یہ زمانہ قدیم سے روایت چلی آرہی ہے کہ نصیحت کرنے والے نصیحت کرتے ہیں اورکسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ سچی بات یہ ہے کہ ملامت کی پرواہ کرنی بھی نہیں چاہئے۔نصیحت کرنے والے دوقسم کے لوگ ہوتے ہیں:

پہلی قسم: ان لوگوں کی ہے جن کی اپنی حالت قابل رحم اور قابل نصیحت ہو۔ان کودوسرے لوگ ان کی پتلی اورناگفتہ بہ حالت دیکھ کرنصیحت کرتے ہوں۔انہیں نصیحتوں کو یہ لوگ آگے دوسروں کوٹرانسفرکردینے میں اپنی دانشمندی خیال کرتے ہوں۔اس لئے کہ ان کو بڑااور

دانشور بننے کا شوق تو ہوتا ہے، لیکن اپنے اندر کوئی ایسی دانشوری والی بات نہیں پاتے جس کی بناء پر وہ واقعی دانا سمجھے جاسکیں، لیکن وہ نصیحت کرنا بھی اپنا فرض منصبی خیال کرتے ہیں۔

دوسری قسم: ان لوگوں کی ہے جو واقعی نصیحت کرنے کے اہل ہوتے ہیں اور ان کی کی گئی نصیحت اس قابل بھی ہوتی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے اور اس قسم کے ناصح اپنے سینوں میں ایسے دل رکھتے ہیں جو انسانوں کی محبت سے لبریز اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے ہردم تڑپتے ہیں، اس لئے وہ ہر مناسب موقع پر نصیحت ضرور کرتے ہیں۔ ان کی وہ نصیحت نہ صرف سنی اور مانی جاتی ہے، بلکہ اس نصیحت کا اثر صدیوں بعد تک بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان کی اس نصیحت کے در پردہ اخلاص کی طاقت کا پورا زور ہوتا ہے۔

الامور بقاصدھا

''دنیا میں کوئی کام کیا جائے تو اس کے کرنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے''۔

اب اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ:

یا تو یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس عمل کے ذریعے سے دنیاوی نیک نامی اور دنیاوی فائدہ حاصل ہو سکے۔

یا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس نیک عمل کا نعم البدل آخرت کی دائمی و سرمدی زندگی کی کامیابی کی صورت میں مل جائے، جن لوگوں کے ہاں فائدہ صرف دنیا میں ہی حاصل ہوتا ہے ان کے ہاں بھی نصیحت کرنے کا رواج ہے اور وہ لوگ اس کو عمدہ فعل خیال کرتے ہیں لیکن اس عمل میں ان کے سامنے صرف مادی منفعت اور دلی تسکین ہوتی ہے کہ چلو میں تو اس جہاں سے جا رہا ہوں۔ اور میرے جانے کے بعد میرا مال و دولت کسی شخص کے کام آجائے گا، یا اس کی وجہ سے کسی شخص کا بھلا ہو جائے گا اور یہ سوچ بھی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس شخص کو کامل طور پر یقین ہو جائے کہ اس مال و دولت کا استعمال میرے لئے ممکن نہیں رہا، بلکہ میرے بعد شاید اس کا کوئی وارث بھی نہ ہو، اس لئے وہ اپنے ہی مال کو محفوظ اور اپنی مرضی کے مطابق صرف کرنے کا عزم لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس شخص کے سامنے اصل نقطہ

نظر اپنا وقتی مفاد اور ذاتی اغراض کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اور یہ بھی دنیا داری کا ایک پہلو ہے۔ آجکل کا ماحول یہ بن چکا ہے کہ ایسے شخص کو بڑا دانا اور دانشمند تصور کیا جاتا ہے۔

وصیت کی ناجائز قسم:

اس دانشمندی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی غرض سے بعض اوقات انسان اپنی اشیاء کے علاوہ ایسی چیزیں جو اس کے پاس چندروز کے لئے ودیعت کی گئی ہیں ان کو بھی لوگوں میں بانٹنے کی وصیت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس کی سب سے معروف مثال یہ کہ بعض لوگ مرنے سے پہلے اپنے اعضاء ڈونیٹ کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہمارے مرجانے کے بعد ہماری آنکھیں ،یا گردے، یا دماغ، یا دل، یا دوسرے اعضاء یا جو عضو جس کی کسی شخص کی ضرورت ہو نکال کر اس ضرورت مند کو دے دیئے جائیں۔ یہ بھی لوگوں کی خدمت گزاری کا ایک انداز ہے لیکن انسان کی بے وقعتی کی طرح یہ وصیت بھی عارضی اور وقتی ہوتی ہے۔ اور ان اعضاء سے بہت محدود اور تھوڑے وقت کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ایک قسم کی وصیت وہ ہے جس میں آخرت کا فائدہ اور مرنے کے بعد کی ابدی زندگی پیش نظر ہوتی ہے اس میں نہ صرف ہمیشہ کا فائدہ ہوتا ہے بلکہ ایک لمبے وقت کے لئے زیادہ افراد اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

تاریخ میں ناصحین کی تعداد

تاریخ میں اس کا آغاز حضرت لقمان علیہ السلام سے ثابت ہوتا ہے جب انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے وصیتیں کیں اور بیٹے سے کہا کہ اے میرے بیٹے شرک نہ کرنا، اور زمین پر تکبر کے ساتھ زندگی نہ گزارنا، اور لوگوں کے ساتھ ترش روئی سے پیش نہ آنا۔ اسی طرح ہمارے فارسی ادب میں 'صد پند لقمان' جسکو شیخ فرید عطار نے اپنی بہت قیمتی تصنیف پند نامے کے آخر میں مندرج کیا ہے، انسانوں کے لئے ایک جاندار اور مضبوط لائحہ عمل کی بہترین مثال ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام نامی آتا ہے جو اپنی قوم کو مختلف انداز سے مخاطب کرتے ہوئے انہیں راہ راست کی طرف بلاتے ہیں۔

وہ کبھی اپنے والد کو مخاطب کرتے ہوئے شرک سے باز آجانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ کبھی مال و دولت کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں بتوں کی تجارت اور بتوں کی صنعت سے منع فرماتے ہیں۔ کبھی اپنی قوم کے عام افراد کو عملی طور پر بتوں کو توڑ کر راہ راست کی طرف دعوت ارشاد، وسعادت مندی کا مژدۂ جاں فزاء سناتے ہیں۔ کبھی آگ کا جھولا جھول کر نمرود کو اس دنیا کی کمزوری اور اللہ تعالی کی اپنی کائنات پر مکمل قبضہ وقدرت کی تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد سیدنا مسیح علیہ السلام کا نام نامی آتا ہے۔ جنھوں نے اپنے دور کے مادیت پرست، اور دہریہ مزاج لوگوں کو اللہ تعالی کی طرف اس انداز سے بلایا کہ اس وقت کے دہریہ لاجواب ہوجانے کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کی جان کے دشمن بن گئے اور آپ کو ان بدمزاج اور مصنوعی عزت وناموس کے محافظوں، اور رب العالمین کے ازلی قانون کو بدل دینے والے فریسیوں، اور صدوقیوں، کاہنوں اور جوتشوں، راہبوں اور تاجروں کو اہل دین وایمان کے سامنے اپنی جان کے لالے پڑ گئے، اور انہوں نے اس بغض وعناد کی آتش نمرود بجھانے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کردینے کا پروگرام مرتب کرلیا اور اس باطل مقصد کے حصول کے لئے جھوٹی اور مصنوعی ترکیبیں لڑانے لگے، جبکہ دوسری طرف رب رحمان نے اپنی خاص کرم فرمائی کی اور ان بدباطنوں سے آپ کو محفوظ کرتے ہوئے

بل رفعه الله اليه

کا کلمۂ دل ربا سنادیا، جو اہل ایمان کے لئے کامیابی کی نوید اور اہل کفر والحاد کے لئے وعید ہی وعید تھی۔

اس قافلۂ راہ روئے دلبراں کے آخری تاجدار، قافلۂ حق وصداقت کے سرخیل، امام الانبیاء، تاجدار دارین، شفیع المذنبین ومتقین، داعی لقاء مع اللہ، باعث تخلیق کائنات، اور وجہ

اعطائے نبوت ورسالت، حضرت محمد مصطفےٰ، احمد مجتبےٰ کو مبعوث فرمایا اور آپ نے صفحۂ ہستی پر سب سے تھوڑے وقت میں سب سے بڑا کارنامہ سرانجام دیا، اور دنوں میں کلمۃ اللہ کو عام کردیا۔ آپ نے اپنے ماننے والوں کو جو وصیتیں اور نصیحتیں ارشاد فرمائیں، ان کی گنتی کرنا، اوران کو شمار میں لانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اور بہت سارے لوگوں نے وصایا رسول کے نام سے کئی کئی جلدوں میں کتابیں مرتب فرمائی ہیں۔ آپ نے خود بھی فرمایا:

اوتیت جوامع الکلم

یعنی مجھے اللہ تعالی کی طرف سے جامع کلمات کے انداز میں گفتگو کرنے کا ملکہ دیا گیا ہے۔ آپ کی وصیتیں اور نصیحتیں نہ صرف اپنوں بلکہ غیروں کو بھی دین کی طرف بلانے کا کام دیتی ہیں، نہ صرف گذشتہ زمانے میں بلکہ آج بھی، اور قیامت کی صبح تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے کلمات دنیا کی تقدیر بدلنے کا کام کرتے رہیں گے۔ آپ کے بعد جو بھی پیغام علم وحکمت دنیا کے سامنے آئے گا، یا دنیا میں رشد وہدایت کا پرچم لہرائے گا وہ درپردہ آپ ہی کے خوشہ چینوں میں شمار کیا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد وصیت کا عمل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ ہی کے روحانی تصرف اور وسیلہ جلیلہ کے فیض سے فیض یاب ہونے والے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام مبارک پانے والے متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زیارت سے مشرف ہونے والے، اللہ تعالی کو عبادت کے ذریعے خوش کردینے والے، امام الائمہ سراج الامۃ، مقتدائے اولیاء واصفیاء، راہبر وراہنماء، امام اعظم برحق، ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کا نام نامی واسم گرامی آتا ہے:

حضرت امام اعظم کی ولادت باسعادت ایسے وقت میں ہوئی جبکہ صحابہ کرام کی ایک کثیر تعداد ابھی دنیا میں موجود تھی۔ اگرچہ حضرت امام اعظم کی ولادت باسعادت کے بارے میں مؤرخین کے درمیان تین رائے مروج ہیں: پہلی رائے یہ کہ آپ کی ولادت سن

ساٹھ ہجری میں ہوئی ہے، اس کو علامہ الکردری نے المناقب میں اختیار کیا ہے، دوسری رائے یہ کہ آپ کی ولادت سن ستر ہجری میں ہوئی ہے اس کو علامہ زاہد الکوثری نے اختیار کیا ہے اور ہماری تحقیق بھی اس کے مطابق ہے۔ اسی لئے ٹائٹل پر حضرت امام اعظم کے اسم گرامی کے ساتھ اسی تاریخ کو لکھا گیا ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ آپ کی ولادت سن اسی ہجری میں ہوئی ہے۔ اس کو بھی بہت سارے لوگوں نے اختیار کیا ہے،

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو سب سے آخری صحابی جنہوں نے اس اس دنیا سے رحلت فرمائی ان کا اسم گرامی حضرت ابوطفیل عامر بن واثلہ الدوسی ہے جن کی اس دار فانی سے رحلت ۱۲۰ ہجری میں ہوئی اور اس وقت حضرت امام اعظم کی عمر مبارک ۴۰ برس کو پہنچ چکی تھی۔ آپ نے متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زیارت کی۔ اس بات کو جمہور اعلام امت نے تسلیم کیا ہے اس کی تفصیل ہماری تصنیف ''امام اعظم کی وصیتیں اور نصیحتیں'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے بعد امت کے ناصح اعظم:

آپ نے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے روایت نقل کی ہے جس کے لئے ہماری تالیف ''عشرین لابی حنیفہ'' ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح آپ نے بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کسب علم وفیض بھی کیا تھا۔ جس کی تفصیل حضرت الاستاذ مولانا عبد الرشید نعمانی کی تصنیف لطیف ''امام ابوحنیفہؒ کی تابعیت اور صحابہ سے ان کی روایت'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر مفصل انداز میں اور سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ تفصیل کے لئے مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں ہمارے پیش نظر اختصار ہے۔

آپ نے جن حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی زیارت یا ہم عصری اور ان سے کسب فیض کیا ان میں بعض نام برائے تبرک ہم ذیل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ ۸۷ ہجری

(۲) حضرت انس بن مالک: ۹۳ ہجری

(۳) حضرت عمرؓ بن حویرث: ۹۸ ہجری

(۴) حضرت عبداللہ بنؓ حارث بن جزء: ۸۸ ہجری،

(۵) حضرت واثلہؓ بن اسقع: ۸۵ ہجری

(۶) حضرت سہلؓ بن سعد ۸۸ ہجری

(۷) حضرت محمودؓ بن ربیع: ۹۹ ہجری

(۸) حضرت محمود بنؓ لبید: ۹۶ ہجری

(۹) حضرت عبداللہ بنؓ البسر مازنی: ۹۶ ہجری

(۱۰) حضرت ابوامامہؓ باہلی: ۸۶ ہجری

(۱۱) حضرت ہرماس بنؓ زیاد: ۱۰۱ ہجری اور

(۱۲) حضرت ابوطفیلؓ دوسی ۱۲۰ ہجری

خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ بھی متعدد صحابہ کرام ہیں آپ کو جن کی نہ صرف ہم عصری کا شرف حاصل ہوا، بلکہ ان میں متعدد حضرات کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ بعض حضرات نے ان کی تعداد ۳۶ تک شمار فرمائی ہے۔

بعض بیمار ذہنوں میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اتنی چھوٹی عمر میں کسب علم وفیض کیسے ہوسکتا ہے جبکہ مثلاً حضرت امام اعظم کی عمر مبارک آٹھ نو برس کی ہو۔ اس وقت میں آپ نے صحابہ کبار سے کیسے کسب فیض کیا ہوگا؟

یہ بات اعتراض، نقل اور تجربہ ہر لحاظ سے کمزور ہے، اس لئے کہ اگر پانچ برس کی عمر میں کسی صحابی کی صحابیت ثابت ہوسکتی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ پانچ برس میں کسی تابعی کی تابعیت ثابت نہ ہوسکے۔ تاریخ وسیر کی کتب میں ایسے متعدد اصحاب نبی کے نام موجود ہیں جو

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رحلت فرمانے کے وقت پانچ برس کی عمر کو پہنچے تھے۔ ان میں حضرت مروان بن حکم، اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا شمار بھی کیا جاسکتا ہے، لیکن آج تک امت میں سے ایک شخص ایسا نہیں گذرا جس نے اس بات میں کلام کیا ہو کہ ان حضرات کی صحابیت ثابت نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانے میں ایسے بیسیوں واقعات ملتے ہیں کہ چھوٹی عمر کے معصوم بچے قرآن کریم کے حافظ بن گئے کیا خیر القرون میں جب حصول علم کی ساری بنیاد حافظے اور یاد داشت پر ہی رکھی گئی تھی، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زیارت، اور علم میں اپنی سند عالی کرنے کا شوق اور رواج اپنے عروج کو پہنچا ہوا تھا، کیا اس وقت امام اعظم کے حج کرنے کے دوران مکہ یا مدینہ میں متعدد بار اصحاب پیغمبرؐ کی زیارت کے شرف سے جہاں دنیا مشرف ہو رہی ہوتی تھی، تو آپ اس شرف زیارت سے کیسے محروم رہ گئے۔ موجودہ زمانے میں بعض لوگ زیارت اصحاب نبی سے آپ کو محروم ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، لیکن ان کے اس عمل میں در پردہ کیا عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں؟ یہ سوچنے اور تدبر کرنے والی بات ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں فکری پسماندگی سے محفوظ فرمائے اور ہمارے حال پر رحم فرمائے آمین!!

مزید یہ کہ ذہین لوگوں کی کم عمری ان کے لئے حصول علم اور اہل فیض سے فیض یاب ہونے میں مانع نہیں ہوا کرتی اور ویسے بھی مجھ جیسا درمیانے درجے کا بندہ جس کو آج بھی اپنے بچپن کا واقعہ یاد ہے۔ ایک بار میرے والد مجھے حضرت مولانا ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ انہی شریف والوں کے پاس لے کر گئے۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر اپنی جھولی میں بٹھا لیا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ وہ اس وقت خود چل پھر بھی نہیں سکتے تھے اور بہت کمزور تھے جبکہ اس وقت میری عمر پانچ سال سے بھی کم تھی۔ مجھے وہ باتیں بھی یاد ہیں جو اس وقت آپ نے فرمائی ہیں۔ اگر چودھویں صدی کے ایک عام آدمی کی یادداشت کی یہ کیفیت ہو سکتی ہے، تو مشکاۃ نبوت سے منور ہونے والے اور انوارات نبوی سے مستنیر ہونے والے زمانے میں جو رحمت

خداوندی کی بارش ہوتی ہوگی تو اس وقت کے لوگوں کا عالم کیا ہوگا۔

اعتراض کر لینا تو بڑا آسان کام ہوتا ہے، لیکن لطف اس بات میں ہے کہ بندہ اصل حقائق کو خندہ پیشانی کے ساتھ تسلیم کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید محققین میں سے استاد ابو زہرہ نے بھی آپ کی تابعیت کو تسلیم کیا ہے آپ فرماتے ہیں:

''امام صاحب کے مناقب نویس تو سب یہی کہتے ہیں کہ آپ بعض صحابہ سے مل چکے تھے، بلکہ بعض صحابہ سے روایت کرنے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس بناء پر آپ کو تابعی کے رتبے پر فائز کہا گیا ہے اور اس طرح گویا آپ کو اپنے معاصر فقہاء مثلاً سفیان ثوری اوزاعی اور مالک وغیرہم پر انکی فضیلت ثابت ہوگئی'' (حیات امام ابوحنیفہ: ۱۲۰)

اس بات کو تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں کہ آپ نے جس عمر میں صحابہ کرام سے احادیث کی سماعت کی تھی کیا اس عمر میں کوئی بچہ سماعت کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟

اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی روایت اور رؤیت تسلیم کی جاسکتی ہے اور تسلیم کی جاتی ہے جبکہ آپ کی عمر مبارک وصال نبوی کے وقت پانچ برس سے بھی کم تھی تو کیا وجہ ہے کہ امام اعظم کی عمر مبارک اس سے بھی زیادہ ہو اور ہم آپ کی تابعیت کو ماننے سے صرف اس لیے لیت و لعل سے کام لیں کہ ہمارا ان کے ساتھ مسلک نہیں ملتا یا ہم ان کے طریقے پر نہیں ہیں۔

حق بات کو ماننے میں کسی دانشمند کو لیت و لعل کرنا اس کی دانشمندی کی علامت نہیں ہے، امام اعظم تو متعدد صحابہ کرام کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو منوّر کر چکے تھے اور ان میں سے آخری صحابی جب اس دنیا سے رخصت ہوئے اس وقت آپ کی عمر مبارک ۴۰ برس کے قریب تھی۔ لیکن بعض لوگ پھر بھی اس بات پر اصرار کرتے چلے جاتے ہیں کہ نہ تو آپ نے کسی صحابی کی زیارت کی اور نہ ہی کسی صحابی سے روایت نقل کی ہے، کیسی ناانصافی کی بات ہے؟

حق بات یہ ہے اور حق ہی اس لائق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے کہ امام اعظم نے متعدد صحابہ کرام کی زیارت کی ہے، اور جب آپ خود یہ فرماتے ہیں کہ میں سات صحابہ کرام کو ملا ہوں اور ان سے میں نے احادیث سنی ہیں۔ وہ احادیث ہم نے اپنی تالیف ''عشرین

لابی حنیفہ" میں جمع کردی ہیں۔ وہاں ان کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ: آخر کچھ لوگ اس بات پر کیوں اصرار کرتے چلے جاتے ہیں کہ نہیں امام صاحب نے تو کسی صحابی کو نہیں دیکھا؟

اللہ اعلم! وہ لوگ اپنے اس دعوی میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اور اپنے اس دعوے میں عام لوگوں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ بہر حال جہاں امت کے اساطین نے وعظ ونصیحت کا بازار گرم رکھا وہاں فرمان نبوی الدّین النّصیحة

دین سراسر خیر خواہی کا نام ہے کی پاسداری کرتے ہوئے حضرت امام اعظم نے بھی مختلف احباب کو مختلف اوقات میں مختلف انداز سے نصیحتیں فرمائی ہیں۔

نصیحت اصل میں دوسروں کی خیر خواہی کا نام ہے، جو شخص جتنا زیادہ خیر خواہی کرنے والا ہوگا وہ اتنا ہی اچھا ناصح ہوگا، اور حضرت امام اعظم کی پوری کی پوری زندگی، چاہے مالی لحاظ سے ہو یا علمی لحاظ سے ہو یا عملی لحاظ سے ہو، دوسروں کی خیر خواہی کا کامل ومکمل مرقع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خاص وعام، دوست یا دشمن، اپنا یا پرایا، مسلمان یا غیر مسلم، متبع یا مخالف امام اعظم کی خیر خواہی کا تذکرہ کرتا نظر آتا ہے۔ اسی خیر خواہی کے بارے میں امام اعظم کے شاگرد اور اپنے وقت میں علوم عربیہ اور علوم حدیث کے امام حضرت زفر بن ہذیلؒ فرماتے ہیں:

جالست ابا حنيفة اكثر من عشرين سنة ، فلم ار احدا انصح للناس منه ، ولا اشفق عليه منه . وكان يذل نفسه لله ، امّا عامة النّهارفهو مشغول فى العلم ، وفى المسائل ، وتعليمها ، وفى ما يسئل عن النوازل ، وجوابتها ، واذا قام من المجلس عاد مريضاً ، او شيع جنازةً ، او وَاسى فقيراً ، او وصل له ، او سعى فى حاجة ، فاذا كان اللّيل خلا للعبادة ، والصلاة ، وقرائة القرآن ، فكان هذا سبيله حتى توفى رحمه الله (المناقب للمكى : ۱۵۲ ج ۱)

میں نے بیس برس تک امام اعظم کی خدمت میں رہ کر دیکھا ہے، اور میں نے آپ

سے بڑھ کر کسی کو نصیحت کرنے والا، اور شفقت کرنے والا نہیں پایا۔ آپ کی یہ حالت تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہت عاجزی کرنے والے تھے۔ آپ کا سارا دن تعلیم و تعلّم کی مصروفیت میں گزرتا یا لوگوں کو مسائل بتانے میں اور تلامذہ کو نئے پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ جب آپ کی علمی مجلس ختم ہو جاتی تھی تو آپ کسی مریض کی عیادت کے لئے یا کسی فوت شدہ کے جنازے میں شمولیت کے لئے یا کسی مفلس کی غم خواری میں یا کسی عزیز کی صلہ رحمی میں یا کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ جب رات چھا جاتی تو آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز میں مصروف ہو جاتے تھے یا قرآن کریم کی تلاوت میں لگ جاتے تھے۔ آپ کا یہ معمول اس دار فانی سے کوچ کرتے وقت تک جاری رہا۔

امام اعظمؒ کے ایک شاگرد امام ابراہیم بن رستم فرماتے ہیں:

كان ابو حنيفة طبيبُ هذه الامّة لان الجهل هو الداء الذى لا غاية بعده ، ففسّر العلم ابو حنيفة تفسيراً شافياً انتهى به الجهل (ابوحنیفہ النعمان: ۹۱)

امام ابوحنیفہ اس امت کے طبیب ہیں کیونکہ جہالت ایسی بیماری ہے جس کو یہ بیماری لگ جائے اس کا مداوا ممکن نہیں ہے۔ علم ایسی دوا ہے جس کے بعد کوئی اور دواء ایجاد نہیں ہوئی جو اس مرض کا مداوا بن سکے اور امام ابوحنیفہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے علم کی ایسی کامل اور مکمل تفسیر کی ہے جس سے جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے آپ کے جاری کردہ علم کی تند و تیز ہواؤں کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔

امام اعظمؒ کی ان وصیتوں کی اہمیت کے پیش نظر امام زرنوجیؒ اپنے طالب علموں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ينبغى لطالب العلم ان يحصل على كتاب الوصية التى كتبها ابو حنيفة ليوسف بن خالدُ السمتى البصرى رحمة الله عليه عند رجوعه الى اهله يجده من يطلبه وقد كان استاذنا شيخ الاسلام

برهان الائمة علی بن ابی بکر قدس الله روحه العزیز ، امرنی بکتابته عند الرجوع الی بلدی و کتبته ، ولا بد للمدرس والمفتی فی معاملات الناس منه (تعلیم المتعلم : ۱۵)

ہر طالب علم کو چاہئے کہ اپنی علم کی طلب کے دوران میں وہ وصیت نامہ ضرور حاصل کرلیا کرے جو امام اعظم نے اپنے شاگرد یوسف بن خالد سمتی کو اس وقت لکھی تھی جب وہ حصول علم کی تکمیل کے وقت اپنے گھر لوٹنے لگے تھے۔ ہمارے استاذ شیخ الاسلام برہان الدین علی بن ابو بکر مرغینانی نے ہماری فراغت علم کے وقت ہمیں نصیحت فرمائی تھی کہ ہم اپنے گھر لوٹنے سے پہلے اس کو ضرور لکھ لیں۔ ہر اُستاد اور معلم کو اور ہر مفتی کو چاہئے کہ وہ اس وصیت نامے کو سامنے رکھتے ہوئے، لوگوں کے ساتھ، اپنے سارے معاملات کیا کرے۔

ان وصایا میں جو خیر و برکت ہے، اس کو ہر زمانے کے ائمہ اعلام نے اپنی جگہ پر تسلیم بھی کیا اور محسوس بھی کیا ہے۔ اسی خیر و برکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام المکیؒ نے المناقب میں فرمایا:

نعمان ارهب بالمواعظ حسنة فرأو روا الحق فی ارهابه

امام ابوحنیفہ اپنے وعظ حسنہ و نصیحت کے ذریعے اپنے احباب کو ڈراتے رہتے تھے اور ان کے اس ڈراوے میں تم دیکھو گے کہ حق کی روایت ان کے انداز بیان اور ان کے پرشکوہ الفاظ میں پوشیدہ ہے۔

اَو سئلتَنی عنه وعن ادابه فاقراء وصایاه الی اصحابه

تم مجھ سے امام اعظم اور ان کے وصایا کے ادب و آداب کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو؟ بات یہ ہے کہ ان کے وصایا پوری توجہ کے ساتھ پڑھو، جو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو لکھے تھے، تو تمہیں ان کی افادیت و آداب کا خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

ترعالم الفقه المعظم شانه والحلم و التقوی ضمیر اهابه

جب تم ان کی نصیحتوں کو ایک سرسری نظر سے دیکھو گے، تو تم خود امام اعظم کے بارے

میں محسوس کرو گے کہ آپ علم فقہ میں بڑی اونچی شان والے ہیں اور حلم و بردباری، اور تقوی میں اللہ تعالی کے خوف سے کانپنے والا دل رکھنے والے ہیں۔

وتری العبادة والتحزّن والبکاء الخوف قائمة الی محرابه

اور تم ان کو اللہ تعالی کی عبادت میں، اور اللہ تعالی کی ملاقات کے غم میں، اور اس کے سامنے رونے دھونے میں، اور نماز کی جگہ میں اللہ تعالی کے خوف میں محو اس کی عبادت کرنے میں مصروف پاؤ گے۔

اقراء کتاب ابی حنیفة تلتقط درر السّعادة من سطور کتابه

امام اعظم کی کتب سے استفادہ کیا کرو، اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ امام اعظم اپنے عظیم انداز بیان میں ساری دنیا کے لوگوں کے لئے علم دین کی دکان سجائے ہوئے ہیں۔اور آپ خود ہی اس کے نگہبان بنے ہوئے ہیں۔

ان الائمة کلّ هم من بعده فی رفعة الغبرآء من کتابه

امام اعظم کے بعد دنیا کے تمام ائمہ کرام ان کی کتابت علم کی، گرد راہ کے راہی بنے ہوئے انھی سے استفادہ کرنے میں مصروف نظر آئیں گے۔

امام اعظم کے وصایا شریف اور ان کی تعداد:

امام اعظم نے ویسے مختلف لوگوں کو بے شمار نصیحتیں فرمائی ہیں جن کا شمار اور ان کی تعداد کا اندازہ کرنا ایک بڑا اور مشکل کام ہے۔ اگر اللہ تعالی نے استطاعت نصیب فرمائی تو اس بارے میں بھی ضرور کام کیا جائے گا، لیکن ان میں سے وہ خاص احباب جن کو آپ نے نصیحت فرمائی ان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، وہ یوں ہیں:

امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری کے نام!

ایک وصیت جو امام اعظم نے اپنے شاگرد امام ابو یوسف کو فرمائی تھی، اس کا وقعہ یوں ہے کہ جب آپ نے ابو یوسف میں اس بات کی استعداد محسوس کی کہ وہ کہیں بھی جا کر علم فقہ کے بارے میں تعلیم و تعلّم کا فریضہ احسن طریقے سے انجام دے سکیں گے تو آپ نے انھیں

ایک وصیت ارشاد فرمائی جس کو علامہ ابن نجیم نے الاشباہ والنظائر میں؛ علامہ الکردری نے المناقب میں، اور علامہ المکی نے المناقب میں نقل فرمایا، اور اس کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی علماء کی بہت بڑی جماعت نے کئے ہیں، اور اس کو کئی ائمہ نے اپنی کتب میں نقل کیا ہے، جس کا احاطہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے

صاحب زادے حضرت امام حماد کو وصیت

امام اعظم نے اپنے صاحب زادے کو وصیت کرتے ہوئے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں اور وہ حضرت صاحبزادہ صاحب کی سند سے منقول بھی ہیں اور دنیا میں معروف اور متداول بھی۔

ان تمام وصیتوں میں سے اس وقت ہم صرف دو وصیتیں ترجمہ اور ضروری حواشی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، عین ممکن ہے کہ علمائے کرام ان وصیتوں کے بعض مقامات یا بعض کلمات میں اختلاف یا فرق محسوس کریں، اس کے بارے میں یہ وضاحت کر دینا اس وقت بہت ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس تحقیقی کام کے دوران ان وصیتوں کے بارہ سے زیادہ قلمی، اور مطبوعہ نسخے نیز شروحات والے نسخے ہمارے سامنے تھے۔ ہم نے اس طرح ایک جامع متن تیار کیا ہے۔ ان شاء اللہ اس میں مفہوم ومعانی یا الفاظ میں امام اعظم کے منہج وطریقہ کار سے ہٹی ہوئی کوئی بات آپ محسوس نہیں فرمائیں گے، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ امام اعظم کی روح مقدس اس کام میں خود ہماری معاونت ورہنمائی فرما رہی ہو۔ گویا اس لحاظ سے آپ کے ہاتھوں میں ایک کامل ومکمل وصیت کا متن ہے جس میں ان شاء اللہ انسانی کاوش کی حد تک کوئی کمی نہیں ہے، اور آپ خود بھی اس متن پر اعتماد کر کے اگر اپنی تحقیق وتشریح کرنا چاہیں تو آپ کو اس بات کی اجازت ہے، اور کامل ومکمل تو اللہ تعالی کی ذات ہے۔

پہلی وصیت کا تعارف:

امام اعظم نے امت کے تمام افراد کے نام ایک وصیت فرمائی جس میں کل بارہ علامات ارشاد فرمائی ہیں۔ اس کے راوی حضرت امام حماد بن امام اعظم اور امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم ہیں، یہ وصیت بارہ علامات کا مجموعہ ہے جس کو ہم نے مزید آسانی کے لئے مسائل میں تقسیم کر دیا ہے۔ یوں اس کے چالیس مسائل بن گئے ہیں، لہذا یہ چالیس مسائل ایسے ہیں جن کو معلوم کر لینے اور ان کو اچھی طرح جان لینے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لینے کے بعد ہر شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبری جیسی نعمت عظیمہ سے مستفید ہو سکتا ہے۔ امام اعظم نے خود ارشاد فرمایا

فَمَنْ کان یستقیمُ عَلیٰ هٰذِهِ الْخِصَالِ لاَ یَکُونُ مُبْتَدِعاً وَلاَیَکُونُ صَاحِبَ الْهَوَیءِ.

فَعَلَیْکُمْ ! اَصْحَابِیْ وَاَخوَانِیْ بِهٰذِهِ الْخِصَالِ. حَتّٰی تَکُوْنُوْا فِیْ شَفَاعَةِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ ا یَوْمَ الْقِیَامَةِ.

جو شخص ان وصیتوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے گا، وہ کبھی بدعتی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی وہ اہل ہواء میں سے ہو سکتا ہے۔ اے میرے دوستو اور بھائیو! جو شخص اپنے آپ کو میری ان وصیتوں کے مطابق ڈھال لے گا، اس کو قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ضرور میسر آئے گی

اس وصیت نامے میں متعدد بار حضرت امام اعظم نے [نقر] کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ 'ہم اقرار کرتے ہیں' اور یہ اقرار ہی اصل میں ایمان کی علامت ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک ایمان کی بنیاد زبان سے اقرار ہے، اور اسی اقرار سے ہم اپنے عقائد سنوار سکتے ہیں، اور اس وصیت نامے کا یہی بنیادی مقصد ہے۔ ان وصیتوں کی صورت میں امام اعظم نے ساری امت کے تمام افراد کے لئے عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس نعمت کی صحیح معنوں میں قدردانی کی توفیق نصیب فرمائے اور ہمیں اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

حدیث متواتر اور عقائد:

اس موقع پر یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ عقائد اسلامیہ کے اثبات کے لئے نص قطعی جو قرآن کریم کی صورت میں ہوتی ہے وہ کام میں لائی جاتی ہیں، اور یا پھر حدیث متواتر پر بھروسا کیا جاتا ہے، جبکہ آجکل کے فکری انتشار کے دور میں بعض لوگ عقائد کے باب میں ایسی احادیث بھی پیش کرتے ہیں جو خبر واحد ہوتی ہیں اور بعض اوقات اس سے بھی کم درجے کے احادیث کو بنیاد بنا کر بعض اوقات عقائد ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ لوگ طبقہ غیر مقلدین اور بعض حنابلہ ہیں جو عدم تقلید کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان کی ایسی ہی عادت ہے، جبکہ اصل بات یہ ہے کہ عقائد ثابت کرنے کے لئے علم عقائد کے صرف تین اصول ہیں۔ ان میں سے پہلا اصول کتاب اللہ دوسرا اصول سنت متواترہ اور تیسرا اصول اجماع امت ہے جس کے بارے میں علمائے ماتریدیہ اور اشاعرہ اس کو بطور اصول تسلیم کرتے ہیں جبکہ باقی بعض لوگ اس کو عقائد کے ضمن میں بطور اصول تسلیم نہیں کرتے، اور وہ اصول عقائد میں سے اجماع امت کو خارج کردیتے ہیں۔

لہٰذا ان اصولوں سے ہٹ کر صرف احادیث، اخبار واحدہ، یا کسی ایک طبقہ کا نظریہ عقیدہ نہیں بن سکتا، تاوقتیکہ وہ اصول کی پوری بنیاد مہیا نہ کرتا ہو۔

اور حضرت امام اعظم نے اس وصیت نامے میں متعدد مقامات پر عقائد کے بارے میں مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ "اس موضوع پر کثرت سے احادیث وارد ہونے کی بنا پر ہم اس طرح کی رائے رکھتے ہیں"۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کی مسائل میں ہمیں صحیح معنوں میں سمجھ داری نصیب فرمائے۔

دوسری وصیت کا تعارف:

ہمارے اس وصیت نامے میں دوسری اور اہم ترین وصیت وہ ہے جو حضرت امام اعظم نے اپنے بیٹے امام حماد کو خاص طور سے ارشاد فرمائی تھی۔ اس وصیت میں کل بیس باتیں ارشاد فرمائیں ہیں اور ان بیس باتوں میں سے ہر ایک سونے کے پانی کے ساتھ لکھے جانے

کے قابل ہے۔

ان میں جو اہم ترین بات حضرت امام اعظم نے ارشاد فرمائی وہ یوں ہے:

(والتاسع عشر) : ان تعملَ بخمسة احاديثٍ جمعتُها من خمس مائة الفٍ

اور ان بیس میں سے ''انیسویں بات یہ ہے کہ ان پانچ احادیث پر ضرور عمل کیا کرنا (جو وصیت کے متن میں مذکور ہیں) کیونکہ میں نے ان کو پانچ لاکھ احادیث میں سے چنا ہے۔''

اہل علم! یہ جملہ بڑا پر کیف اور لطف کا ساماں مہیا کرنے والا ہے، کیونکہ ایک بہت بڑا طبقہ جہلا یہ سمجھتا ہے کہ اما۔ اعظم ابوحنیفہ کو حدیث تو آتی نہیں تھی اور اگر کوئی بہت بڑا احسان کرتے ہوئے کسی ''محقق العصر'' کا جوٹھا پی کر بہت دور کی کوڑی لائے گا تو یہ فرمائے گا کہ ''ابوحنیفہ کو تو صرف سترہ احادیث آتی تھیں''۔اس کے لئے مذکورہ جملے سرمہ چشم ہیں۔شاید کہ اس کی آنکھیں کھل جائیں، لیکن نہ ماننے کو بہانے بہت، کوئی کرے گا تو کیا کرے گا؟؟؟

اسی وصیت میں ایک اور اہم تر۔ بات جو واقعی آب زر کے ساتھ لکھنے کے قابل ہے۔آپ نے فرمایا:

(والخامس عشر): اَن تکتُمَ سِرَّکَ وَذَھَبَکَ ومَذْھَبَکَ وذِھَابَکَ

اور ان بیس میں ''پندرہویں بات یہ ہے کہ عام لوگوں کے سامنے اپنے راز کو راز رکھنا، اپنے مال کو مخفی رکھنا، اپنی (نجی) گھریلو زندگی کو سرعام بیان نہ کیا کرنا اور اپنا منزل مقصود لوگوں کے سامنے بیان نہ کیا کرنا''

اگرچہ ترجمہ تو آپ حضرات نے دیکھ لیا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی اس کے کئی ترجمے ہو سکتے ہیں۔گویا یہ وصیت ایک کائناتی صداقت کے مترادف ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اپنے اندر اسرار و رموز کے بحر بے کراں سموئے ہوئے ہے۔

بعض دانا لوگوں کا قول ہے تین باتوں کو چھپانا لازم ہے زن، زر، زمین، اور ان کو

چھپانے مین دنیا کی لاتعداد سلامتیاں اور بے شمار آسانیاں ہیں۔ یہ مفہوم سارے کا سارا امام اعظم کے قول میں مضمر ہے۔ اللہ تعالی ان قیمتی اقوال سے ہمیں مستفید ہونے کی توفیق نصیب فرمائے۔

ہم نے افادۂ عام کے پیش نظر اس وصیت کو بھی اپنے اسی مجموعے علامات اہل السنّت والجماعت کے آخر میں بطور خاتمہ کے شامل کرلیا ہے۔ اُمید کرتے ہیں کہ اس سے مستفید ہونے والے حضرات اپنی مقبول دعاؤں میں کاتب الحروف کو ضرور یاد رکھیں گے۔

اگر چہ یہ وصیت نامہ بظاہر امام اعظم نے اپنے بیٹے کو لکھا تھا، لیکن اس کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ ہر پڑھنے والا اپنے آپ کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے۔ اس میں اسلامی عقائد کی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی گزارنے کے بہترین اصول اور ایک اچھا مسلمان بننے کے لئے تمام ضروری باتیں بڑی سادگی کے ساتھ اس میں ذکر کردی گئی ہیں۔

آخر میں میں اپنے ان رفقاء کار کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس عمل میں میری کسی طرح سے بھی مدد کی ہے۔ خاص طور سے اپنے اہل خانہ کا شکریہ ادا نہ کرنا یقیناً احسان فراموشی ہوگا، کیونکہ ان کے قیمتی اوقات میں سے بعض اوقات میں جبراً کچھ وقت اپنے اس کام میں لگالیا کرتا تھا۔

بس دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور ہم سب کو اس کا دونوں جہانوں مین بہترین نعم البدل نصیب فرمائے۔

آخر میں میں بھی اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ میری اولاد اور تلامذہ، متعلقین ومتوسلین میں سے اگر کوئی بھی ایسا فرد ہوا جو عقائد میں اس وصیت کے مطابق نہ پایا گیا تو اس کو اپنے احوال کی اصلاح کرنا لازم ہوگی

''ورنہ اس کا مجھ سے کسی نوع کا کوئی تعلق نہ ہوگا''

وما توفیقی الا باللہ ،وعلیہ توکلت ،وعلیہ فلیتوکل المتوکلون

مقدمۂ محقق

تمام تعریفیں اس ذات باری والاصفات کے لئے مخصوص ہیں جس نے ہمارے دلوں کو ایمان کے نور سے مزین فرمایا اور اس کی تمام رحمتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوں جو نبوت اور رسالت کے منصب کے ساتھ ساری انسانیت اور تمام کائنات کی طرف مبعوث فرمائے گئے؛ اور آپ کی پاکیزہ آل اور برگزیدہ اصحاب کرام پر جو اللہ تعالی کی طرف سے دولتِ ایمان سے قابلِ اکرام بنائے گئے، اور اللہ تعالی کی طرف سے رضاء وخوشنودی کے تمغے سے ذی احترام بنائے گئے، اور تا صبح قیامت ان پاک باز ہستیوں کی اتباع کرنے والے خوش نصیب لوگ بھی اللہ تعالی کی بے شمار رحمتوں سے بہرہ یاب ہوں]۔

وصیت نامہ کی اہمیت

لَمَّا مَرِضَ اَبُوْحَنِیْفَةَ : قَالَ اِعْلَمُوْا اَصْحَابِیْ وَاِخْوَانِیْ ! وَ فَّقَکُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَّ مَذْهَبَ اَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ عَلٰی اِثْنٰی عَشَرَةَ نَوْعاً مِنَ الْخِصَالِ فَمَنْ کَانَ یستقیمُ عَلٰی هٰذِهِ الْخِصَالِ لاَ یَکُوْنُ مُبْتَدِعاً وَلاَیَکُوْنُ صَاحِبَ الْهَوٰیءِ .

فَعَلَیْکُمْ ! اَصْحَابِیْ وَاَخْوَانِیْ بِهٰذِهِ الْخِصَالِ. حَتّٰی تَکُوْنُوْا فِیْ شَفَاعَةِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ ا یَوْمَ الْقِیَامَةِ.

جب امام اعظم ابو حنیفہؒ اپنی مرض وفات میں مبتلاء ہوئے تو اپنے تمام احباب اور شاگردوں کو اپنے قریب بلا کر فرمایا۔

اے میرے ساتھیو اور بھائیو! اللہ تعالیٰ ہر اچھے کام میں تمہاری مدد اور موافقت فرمائے؛ یہ بات جان لو کہ اہل السنّت والجماعت کے فلسفۂ الٰہیات یا علم عقائد میں بارہ باتیں یا علامتیں ایسی ہیں کہ جو شخص ان سے آگاہ ہو جائے اور ان کے مطابق اپنے عقائد کو ڈھال کر، مستقل مزاجی سے ان پر قائم رہے گا، وہ زندگی بھر کبھی اہل بدعت میں سے نہ ہوگا اور نہ ہی طبقۂ ہوا و ہوس کے راہی اس کو اپنے فاسد مقاصد کا شکار کر سکیں گے۔

اور اے میرے دوستو اور بھائیو! اب تم پر لازم ہے کہ ان عادات اور باتوں کو اپنے اندر اختیار کرو تا کہ قیامت کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے حصہ دار بن سکو؛ اور دنیا میں اللہ کی مدد اور نصرت کی ہوئی جماعت اہل السنّت والجماعت میں شامل ہو جاؤ۔

تشریح: یہ وصیت نامہ امام اعظم کا آخری اور سب سے جامع وصیت نامہ ہے اور اس کا مخاطب تا قیام قیامت امت میں سے ہر طبقہ فکر ہے، مابین قوسین جو خطبہ میں چند کلمات ہیں یہ راقم اور حضرت علامہ ملا علی قاریؒ کی طرف سے اضافہ ہیں وما توفیقی الا باللہ

اس وصیت نامے کی تکمیل سے قبل اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت سے امام اعظم کی وصیتوں کو جامع انداز میں عربی اور اردو زبان میں بنام ''امام اعظم کی وصیتیں اور نصیحتیں'' راقم نے مرتب کر کے شائع کر دی ہے جو اس باب میں جامع کوشش ہے۔ ایک کوشش بنام ''علامات اہل السنّت والجماعت'' کے نام سے بھی کی گئی تھی اور قارئین کرام کے ہاتھوں میں موجود کتاب اسی کی اشاعت ثانیہ ہے۔ قبل ازیں ان دونوں کتابوں کی اشاعت کا شرف مکتبہ دار المعارف العلویہ لاہور کو حاصل ہوا تھا۔

اب دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فیض بے بہا سے ہم سب کو استفادہ کرنے اور افادہ عام کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین

يوم القيمة على ما وردت به الاخبار الصحيحة حق كائن، والله يهدي
من يشاء الى صراط مستقيم، والله تعالى لطيف خبير بعباده
بصير، تم فقه الاكبر من تصنيف سراج الائمة محيي
السنة نعمان ابن ثابت ابو حنيفة رحمة الله
تعالى ورضي الله عنه في اواسط
ذي حجة من سنة ست
وعشرين
وخمسين

هذه الوصية منقولة عن الامام الاعظم ابو حنيفة رحمه الله عليه
لاصحابه رضي الله عنهم على مذهب اهل السنة والجماعة لما مرض ابو حنيفة
قال اعلموا اصحابي واخواني ان مذهب اهل السنة والجماعة على اثنى
عشرة خصلة فمن كان يستقيم على هذه خصال لا يكون مبتدعا ولا صاحب
هوى، فعليكم بهذه الخصال حتى تكونوا في شفاعة نبينا محمد صلى الله عليه
وسلم يوم القيمة الاول الايمان وهو اقرار باللسان وتصديق بالجنان
والاقرار وحده لا يكون ايمانا، لانه لو كان ايمانا لكان المنافقون كلهم مومنين
قال الله تعالى في حق المنافقين، والله يشهد ان المنافقين لكاذبون، وقال
الله تعالى في حق اهل الكتاب، الذين آتيناهم الكتاب يعرفونه كما يعرفون
ابناءهم، والايمان لا يزيد ولا ينقص لانه لا يتصور الا بزيادة الكفر ولا
يتصور زيادته الا بنقصان الكفر، وكيف يجوز ان يكون الشخص الواحد في حالة
واحدة مؤمنا وكافرا، والمؤمن مؤمن حقا، والكافر كافر حقا، وليس في الايمان شك
كما انه ليس في الكفر شك لقوله تعالى، اولئك هم المؤمنون حقا واولئك هم الكافرون حقا
والعاصون من امة محمد عليه السلام كلهم مؤمنون حقا وليسوا بكافرين، والعمل غير
الايمان، والايمان غير العمل بدليل ان كثيرا من الاوقات يرتفع العمل عن المؤمن
ولا يجوز ان يقال ارتفع عنه الايمان، فالحائض يرفع الله تعالى عنها الصلوة، ولا يجوز

في حق المؤمنين. أعدت للمتقين. وفي حق الكفرة أعدت للكافرين. خلقهما
الله تعالى للثواب والعقاب. والميزان حق لقوله تعالى. ونضع الموازين القسط
ليوم القيامة. وقراءة الكتب حق لقوله تعالى اقرأ كتابك كفى بنفسك اليوم
عليك حسيبا. الثاني عشر نقر بأن الله تعالى يحيي هذه النفوس بعد
الموت ويبعثهم في يوم كان مقداره خمسين ألف سنة للجزاء والثواب
وأداء الحقوق لقوله تعالى. وأن الله يبعث من في القبور. ولقاء الله تعالى
حق لأهل الجنة بلا كيف ولا كيفية ولا تشبيه ولا جهة. وشفاعة نبينا
محمد عليه السلام حق لكل من هو من أهل الجنة وإن كان صاحب الكبيرة
وعائشة رضي الله عنها بعد خديجة الكبرى أفضل نساء العالمين
وأم المؤمنين ومطهرة من الزنا بريئة عما قالت الروافض
فمن شهد عليها بالزنا فهو كافر. وأهل الجنة في الجنة
خالدون. لقوله تعالى في حق المؤمنين أولئك
أصحاب الجنة هم فيها خالدون. وفي حق
الكفار. أولئك أصحاب النار هم
فيها خالدون

م

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين. والصلاة على محمد وآله أجمعين. ثم يجب على كل عاقل بالغ
أن يؤمن بالله تعالى أنه واحد لا شريك له. ولا نظير له. وهو خالق الخلق ورازقهم
وحافظهم ومحولهم من حال إلى حال. وينزهه عن الولد والوالد. ويعلم أنهم
أنهم عبيده وبكتبه أنها حق وبرسله أنهم مبعوثون بالحق ولا يفرق بين أحد
من رسله. فإذا صلح لكم الحكم بإسلامه. ثم يجب عليه أحكام الإسلام من الصلاة

بسم الله الرحمن الرحیم   کتاب وصیۃ الامام

الاعظم ابی حنیفۃ لاصحابہ رضی اللہ عنہ وعنہم علی مذہب اهل السنۃ والجماعۃ لما مرض ابو حنیفۃ قال اعلموا اصحابی واخوانی ان مذهب اهل السنۃ والجماعۃ علی اثنی عشر نوعا فمن کان یستقیم علی هذا الحصال لایکون مبتدعا ولا صاحب الهوی فعلیکم بهذه الحصال حتی تکونوا فی شفاعۃ محمد ﷺ یوم القیامۃ اولہا الایمان وهو الاقرار باللسان وتصدیق بالجنان والمعرفۃ بالقلب والاقرار وحده لایکون ایمانا لانہ لوکان ایمانا لکان المنافقون کلہم مؤمنین وکذلک المعرفۃ وحدها لایکون ایمانا لانها لوکانت ایمانا لاهل الکتاب کلهم مؤمنین قال الله تعالی فی حق المنافقین والله یشهد ان المنافقین لکاذبون وقال فی حق اهل الکتاب الذین آتیناهم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءهم **فصل** والایمان لایزید ولاینقص لانہ لایتصور نقصانہ الا بزیادۃ الکفر ولایتصور زیادتہ الا بنقصان الکفر وکیف یجوز ان یکون الشخص الواحد فی حالۃ واحدۃ مؤمنا وکافرا والمؤمن مؤمن حقا والکافر کافر حقا ولیس فی الایمان شک کما انہ لیس فی الکفر شک لقولہ تعالی اولئک هم المؤمنون حقا واولئک هم الکافرون حقا والعاصون من امۃ محمد ﷺ کلهم مؤمنون حقا ولیسوا بکافرین **فصل** والعمل غیر الایمان والایمان غیر العمل بدلیل ان کثیرا من الاوقات یرتفع العمل عن المؤمنین ولایجوز ان یقال ارتفع عنہ الایمان فان الحائض یرفع الله سبحانہ وتعالی عنها الصلوۃ ولایجوز ان یقال رفع عنها الایمان او امرها بترک الایمان وقد قال لها الشرع دعی الصوم ثم اقضیہ ولایجوز ان یقال دعی الایمان ثم اقضیہ ویجوز ان یقال لیس علی الفقیر الزکوۃ ولایجوز ان یقال لیس علی الفقیر الایمان وتقدیر الخیر والشر کلہ من الله سبحانہ وتعالی ولو زعم احد ان تقدیر الخیر والشر من غیره لصار بہ کافرا بالله وبطل توحیده **فصل** والثانی نقر بان الاعمال ثلثۃ فریضۃ وفضیلۃ ومعصیۃ فالفریضۃ بامر الله ومشیتہ ومحبتہ ورضایہ وقضایہ وقدره وتخلیقہ وحکمہ وعلمہ وتوفیقہ وکتابہ فی اللوح المحفوظ والفضیلۃ لیست بامر الله لکن بمشیتہ ومحبتہ ورضایہ وقضایہ وقدره

وحکم

ولہ الزنا واهل الجنة في الجنة خالدون واهل النار في النار خالدون لقوله تعالى في حق المؤمنين اولئك اصحاب الجنة هم فيها خالدون وفي حق الكفرة اولئك اصحاب النار هم فيها خالدون ○ تمت الوصية بعون الله وحسن توفيقه ○

اللهم لك صمت وبك امنت وعليك توكلت
وعلى رزقك افطرت ولصوم غد انويت ○

پہلی علامت اوراس میں مذکور مسائل

اس علامت میں چار مسائل بیان فرمائے گئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ اول ایمان کی حقیقت اوراس کے ارکان کابیان:

نُقِرُّ بِاَنَّ اَلْاِیْمَانَ : وَھُوَ الْاِقْرَارُ بِاللِّسَانِ ، وَتَصْدِیْقٌ بِالْجَنَانِ وَالْمَعْرِفَةُ بِالْقَلْبِ ، وَالْاِقْرَارُ وَحْدَہٗ لَایَکُوْنُ اِیْمَاناً لِاَنَّہٗ لَوْکَانَ اِیْمَاناً لَکَانَ الْمُنَافِقُوْنَ کُلُّھُمْ مُؤْمِنِیْنَ ؛ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ حَقِّ الْمُنَافِقِیْنَ :

﴿وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ﴾ (المنافقون:۱)

وَکَذٰلِکَ الْمَعْرِفَةُ وَحْدَھَا لَاتَکُوْنُ اِیْمَاناً لِاَنَّھَا لَوْکَانَتْ اِیْمَاناً لَکَانَ اَھْلُ الْکِتَابِ کُلُّھُمْ مُؤْمِنِیْنَ ؛ وَقَالَ تَعَالٰی فِیْ حَقِّ اَھْلِ الْکِتَابِ :

﴿اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاھُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَھُمْ﴾ (البقرۃ:۱۴۶)

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ایمان ،زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق ومعرفت کا نام ہے۔

اس لئے کہ اکیلا زبان سے اقرار کرنا ایمان نہیں ہوسکتا ،اس لئے کہ اگر اس کو ایمان کہا جائے ،تو سارے منافقین بھی مؤمنوں میں شمار ہونے لگیں گے، کیونکہ سب منافق زبان سے ایمان کا اقرار تو کرتے ہیں، حالانکہ ان کا دل اس بات کی تصدیق نہیں کرتا، جیسا کہ اللہ تعالی نے منافقین کے بارے میں ارشاد فرمایا:

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کے پاس آ کر منافق اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں تو ان کے جواب میں آپ فرمادیں: اللہ تعالیٰ بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں''۔

''اور اللہ تعالیٰ اس بات کی بھی گواہی دیتے ہیں، منافق اپنے ایمان دار ہونے کے دعوی میں جھوٹے ہیں''۔

اس وجہ سے کہ وہ زبان سے ایمان کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر دل سے اس بات کی تصدیق نہیں کرتے۔

اسی طرح دل کی تصدیق اور اکیلی معرفت بھی ایمان نہیں بن سکتی کیونکہ اگر اسکو ایمان مانا جائے تو سارے اہل کتاب مؤمن شمار کئے جانے لگیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

''اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی تھی وہ نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم کو اس طرح جانتے اور پہچانتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کو جانتا اور پہچانتا ہو''۔

مگر زبان سے اقرار نہ کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے ایمان کی کوئی حقیقت اور قدر و قیمت نہیں ہے۔

تشریح: اس مسئلے میں ہمارے اور حنابلہ اور بعض صوفیاء اشاعرہ اور برصغیر کے غیر مقلدین کے درمیان اختلاف ہے:

ہماری رائے تو متن میں بیان ہو چکی ہے جس کا خلاصہ یوں ہے کہ ایمان دو چیزوں کا نام ہے۔ پہلی یہ کہ زبان سے اقرار کیا جائے اور دوسری یہ کہ دل وجان سے اس کی تصدیق کی جائے۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی نہ ہوئی تو ان کا ایمان قابل قبول نہ ہوگا جیسا کہ متن میں اہل کتاب اور منافقین کی مثال دی گئی ہے۔

اشاعرہ، حنابلہ اور بعض صوفیاء اور غیر مقلدین کی رائے یہ ہے کہ ایمان لانے کے تین ارکان ہیں پہلا یہ کہ ایمان لانے میں زبان سے اقرار کرنے، اور دوسرا یہ کہ دل سے ایمان والی اشیاء کی تصدیق کرنے، اور تیسرا یہ کہ اعضاء سے عمل بجالانے کا نام ہے۔ اگر ان تین ارکان میں سے ایک چیز بھی کم ہو جائے تو وہ شخص ایمان والا نہیں رہتا۔ ان حضرات نے اعمال کی بجا آوری کو بھی ایمان کا جزو لازم قرار دیا ہے۔

مسئلہ دوم ایمان میں کمی اور زیادتی کا بیان:

وَالْاِیْمَانُ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ لِاَنَّہٗ لَایَتَصَوَّرُ زِیَادَۃُ الْاِیْمَانِ اِلَّا بِنُقْصَانِ الْکُفْرِ ؛ وَلَایَتَصَوَّرُ نُقْصَانُ الْاِیْمَانِ اِلَّابِزِیَادَۃِ الْکُفْرِ ؛ وَ کَیْفَ یَجُوْزُاَنْ یَّکُوْنَ الشَّخْصُ الْوَاحِدُفِیْ حَالَۃٍ وَّاحِدَۃٍ مُؤْمِناً وَّ کَافِراً حَقًّا .

ترجمہ: اور ایمان لانے کے بعد اس ایمان میں نہ کمی ہو سکتی ہے، نہ زیادتی، کیونکہ ایمان کی ضد کفر ہے اور جہاں ایمان نہیں ہوگا وہاں کفر ہوگا یا جہاں جتنا کم ایمان ہوگا، وہاں اسی کی نسبت سے وہاں کفر سمجھا جائے گا۔ اسی بناء پر ایمان کی زیادتی اس وقت تک تصور نہیں کی جاسکتی جب تک اس کے مدمقابل صفت کفر میں کمی نہ ہو۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں سچا مؤمن بھی ہو اور سچا کافر بھی ہو کیونکہ ایمان اور کفر میں کمی یا زیادتی کوئی مادی چیز نہیں۔

تشریح: اس مسئلے میں ہمارے اور حنابلہ واشاعرہ اور جدید معتزلہ اور برصغیر کے غیر مقلدین وغیرہم کے درمیان اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک ایمان میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے جبکہ ہمارے نزدیک اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ ان کا استدلال اس بارے میں قرآن کریم کی وہ آیات ہیں۔ جو ابتدائے اسلام میں نازل ہوئی تھیں، جبکہ اس وقت اسلام کامل نہیں ہوا تھا بلکہ اسلام کے کامل ہونے سے پہلے ان آیات کا نزول ہوا تھا۔

اور حضرت امام اعظم نے اس مسئلہ کی مزید صراحت اپنی تصنیف الفقہ الاکبر میں مندرجہ ذیل الفاظ سے فرمائی تھی:

"ان الایمان لا یزید ولا ینقص من جهة المؤمن به واما من جهة اليقين والتصديق يزيد وينقص"

یعنی جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان کا لحاظ کرتے ہوئے تو ایمان کم زیادہ نہیں ہو سکتا البتہ یقین اور تصدیق کے لحاظ سے اس میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے۔

اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان لانے کے لئے قرآن کریم کے ابھی چند پارے نازل ہوئے تھے تو اس وقت صرف انھیں پاروں پر ایمان لایا جا سکتا تھا جو ابھی نازل ہوئے تھے۔ اپنی مرضی سے اس میں زیادتی نہیں کی جاسکتی تھی کہ آدمی دس کی جگہ بیس پاروں پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح اپنی مرضی سے اس میں کمی بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ دس کی بجائے پانچ پاروں پر ایمان لے آئے اور باقی پر

ایمان نہ لائے۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ احکامات میں کسی ایک پر بھی ایمان نہ لانا بذات خود کفر تصور کیا جائے گا، اس لئے جوں جوں اللہ تعالی کی طرف سے آیات قرآنی کا نزول ہوتا تھا توں توں مؤمنوں کے ایمان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

اور حضرت ابن عباس سے منقول ہے آپ نے فرمایا:

انهم كانوا آمنوا بالجملة ثم يأتى فرض بعد فرض فيؤمنو بكل فرض خاص فزادهم ايمانا بتفضيل مع ايمانهم بالجملة

بے شک وہ تمام باتوں پر پہلے ہی ایمان لا چکے تھے، لیکن جیسے جیسے اللہ تعالی کی طرف سے کوئی فرض نازل ہوتا جو پہلے نہ ہوتا تھا تو وہ اس پر ایمان لے آتے اور یوں ان کا ایمان پہلے سے زیادہ ہو جاتا تھا اور اس طرح ان کے ایمان کو پہلے سے زیادہ فضیلت حاصل ہو جاتی تھی۔ (الجوہرۃ المنیفۃ: ۵)

اسی بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک وقت وہ تھا جب نزول قرآن ابھی مکمل نہیں ہوا تھا، تو اس وقت ان کے ایمان لانے والوں کا ایمان بھی کم تھا، اور جیسے جیسے اللہ تعالی کے احکامات بڑھتے چلے گئے، ان کا ایمان بڑھتا چلا گیا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب اللہ تعالی نے

(اليوم اكملتُ لكم دينكم)

”آج ہم نے تمہارے لئے اپنا دین مکمل کر دیا“

کی نوید سنائی، اس کے بعد ایمان میں کمی یا زیادتی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات اس لئے ہے کہ ابتدائے اسلام کے وقت ایمان کے مقابل کفر ہی نہیں تھا، بلکہ ایمان کے مقابل عدم نزول احکام ربانی وعدم ایصال اجزائے ایمان ہی تھا۔

اب جب کہ ایمان کا نزول کامل ومکمل ہو چکا ہے، اس لئے اب ایمان میں کمی یا زیادتی اس کی کیفیات کے لحاظ سے تو ہو سکتی ہے، اس کے اجزائے ذات کے لحاظ سے اس میں کمی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے حضرت امام نے ایمان میں کمی یا زیادتی کو یقین اور تصدیق کی کیفیات میں کمی یا زیادتی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، البتہ ایمانیات کے لحاظ سے اس میں کمی یا زیادتی اسی وقت سمجھی جا سکتی ہے جب کہ اس سے بعض ایمانیات کی باتوں کا انکار کر دیا جائے، اور اب وہ زمانہ ہے کہ ایمانیات والی ایک بات کا انکار کرنا گویا سارے ایمان کا انکار ہے، اور یہ بات موجب کفر ہے، نہ کہ موجب کمیِ ایمان ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایمان تو ایک کیفی چیز ہے، لہذا اس میں کمی یا زیادتی کا گمان ہی ناممکن ہے؛ اور کسی چیز میں کمی یا زیادتی مادیت کی صفات سے تعلق رکھتی ہے اور اس کو کسی کیفی چیز کے بیان کرنے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

اس لحاظ سے ایمان میں کمی یا زیادتی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اگر کیا جائے تو وہ موجب کفر ہے، اور اس بات کے خلاف امت کے کسی ایک فرد کا بھی عقیدہ نہیں ہے، اس لحاظ سے امام ابوالحسن ماتریدی نے اس مسئلے کو لفظی نزاع قرار دیا ہے۔ اس بات کو اللہ تعالی احسن انداز میں سمجھنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

مسئلہ سوم ایمان کو مشیت باری کے ساتھ معلق کرنا:

وَالْمُؤْمِنُ مُؤْمِناً حَقًّا وَالْكَافِرُ كَافِراً حَقًّا ؛ وَلَيْسَ فِي إِيْمَانِ الْمُؤْمِنِ شَكٌّ كَمَا أَنَّهُ لَيْسَ فِي كُفْرِ الْكَافِرِ شَكٌّ ؛ لِقَوْلِهِ تَعَالَى :

﴿ أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ﴾ (الانفال:۴)

﴿ أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ﴾ (النساء:۱۵۱)

ترجمہ: اور ہر مؤمن سچا مؤمن ہے اور ہر کافر پکا کافر ہے؛ جیسے مؤمن کے ایمان میں شک نہیں اسی طرح کافر کے کفر میں بھی شک نہ ہو سکے گا جیسے مؤمنوں کے بارے میں اللہ تعالی کا قول ہے:

''یہی وہ لوگ ہیں جو سچے مؤمن ہیں''

اور اسی طرح کافروں کے بارے میں ارشاد باری تعالی ہے:

''یہی وہ لوگ ہیں جو پکے کافر ہیں''

تشریح: اس مسئلے میں بندے کا اپنے ایمان کو مشیت باری تعالی کے ساتھ جوڑنے سے ہے اور اس مسئلے کی وضاحت یوں ہے:

صورت مسئلہ: کیا ایمان لانے کا دعوی کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ دعوی ایمان کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا چاہئے ،یعنی اگر کوئی پوچھے کہ ''کیا تم مؤمن ہو'' تو اس کے جواب میں یوں کہا جائے ''ہاں ان شاء اللہ میں مؤمن ہوں''۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ دنیا کے دیگر امور میں تو ان شاء اللہ کہہ سکتے ہیں ،لیکن ایمان کے بارے میں خبر دیتے ہوئے ان شاء اللہ کہنا جائز نہیں ہے۔

اس مسئلے میں بھی ہمارے ساتھ بعض قدیم اور جدید حضرات کا اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ ایمان کے ساتھ ان شاء اللہ کا لاحقہ لگانے سے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ ہمارے ائمہ کرام کا کہنا ہے کہ ان شاء اللہ کا لاحقہ وہاں لگایا جاتا ہے، جہاں دو باتیں پائی جائیں:

پہلی بات یہ کہ اس کام کے ہونے یا نہ ہونے میں ہماری اپنی مرضی کا کوئی اعتبار نہ ہو، بلکہ اس کے ہونے یا نہ ہونے کا تعلق اللہ تعالی کی مشیت کے ساتھ ہو۔ دوسری بات یہ کہ اس کام کے ہونے یا نہ ہونے کا تعلق زمانہ ماضی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ زمانہ مستقبل کے ساتھ وابستہ ہو۔

جب کوئی شخص ایمان کے ساتھ ان شاء اللہ کا لاحقہ جوڑتا ہے تو گویا وہ اپنے ایمان کے اقرار میں شک اور تردد میں ہے اور وہ شخص جرائت کے ساتھ اپنے ایمان کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔

اس پر حضرت امام ابواللیث سمرقندی نے اپنی شرح فقہ ابسط میں بڑی عمدہ مثال ذکر کی ہے:
وہ فرماتے ہیں جب کوئی شخص کسی کام کا وعدہ کرنے کے بعد ان شاء اللہ کہہ دے تو اس طرح اس کا وعدہ نہیں شمار کیا جاتا، بلکہ اس کا وعدہ باطل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص ایمان لانے کی صورت میں ان شاء اللہ کا لاحقہ یا سابقہ زیادہ کرتا ہے تو اس کا دعوی ایمانی بھی ڈر ہے کہ باطل نہ ہو جائے کیونکہ دنیا کے احکامات کے بارے میں تو ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وعدے کے ساتھ کوئی شخص ان شاء اللہ کہہ دے تو اس کا اس طرح سے کیا گیا وعدہ وعدہ شمار نہیں کیا جاتا تو ایمان کے بارے میں اگر ایسا ہوگا تو ہمارے پاس ایمان میں سے کیا باقی بچے گا۔

اس مسئلے کی مزید وضاحت امام اعظم نے فقہ اکبر، فقہ ابسط، عالم و متعلم میں تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائی ہے،

جس کا خلاصہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کلمۂ ایمان کے ساتھ ان شاء اللہ کا لاحقہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ایمان لانے والے کو اپنے ایمان کے دعوے میں شک ہے، اور یہ کیفیت کفر کا موجب ہوسکتی ہے، لہٰذا اس سے بچنا لازم ہے تا کہ ایمان کے معاملے میں شک کی کیفیت پیدا نہ ہو۔

اور علامہ حسین بن اسکندر حنفی اس کا خلاصہ یوں ارشاد فرماتے ہیں:

والحاصل: ان المؤمن اذا قال انا مؤمن حقا يكون مصيبا بالاتفاق، وان قال انا مؤمن ان شاء الله فان قصد التعليق بالمشية فى الحال كان مخطئا بالاتفاق ، وان قصد التعليق فى المستقبل لا يكون مخطئا بالاتفاق لجوهرة المنيفة: ٦

اور خلاصہ کلام یوں ہوا کہ اگر کوئی مؤمن یہ کہے کہ میں سچا مؤمن ہوں تو اس کے سچائی کا اقرار کرنے کے وجہ سے اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اور اگر وہ یہ کہے کہ میں ان شاء اللہ مؤمن ہوں، تو دیکھا جائے گا کہ اس نے کیا اس وقت ایمان لانے کی بات کو معلق کیا ہے تو وہ غلطی پر ہے، اور اگر اس نے آئندہ زمانے میں ایمان لانے کی بات کو معلق کیا ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی۔ اس کو غلط نہیں کہا جائے گا۔

مسئلہ چہارم ایمان کے ساتھ ارتکابِ گناہ کا حکم:

وَالْعَاصُوْنَ مِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ ا مِنْ اَهْلِ التَّوْحِيْدِ كُلُّهُمْ مُؤْمِنُوْنَ وَ لَيْسُوْا بِكَافِرِيْنَ .

ترجمہ: اور معلوم ہونا چاہیے کہ اُمتِ محمدیہ کے وہ لوگ جو توحید باری تعالیٰ کے قائل ہیں گناہ گار ہونے کے باوجود مؤمن ہیں، وہ کافر ہرگز نہیں ہیں۔

تشریح: اس مسئلہ کے بارے میں اختلاف کی نوعیت یوں ہے کہ ایمان لانے کے بعد اگر کوئی شخص گناہوں میں مبتلاء ہو جائے تو کیا اس کے ایمان میں ان گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے کوئی خلل پیدا

ہوگا یا نہیں؟

ایک طبقہ قدیم اور موجودہ زمانے میں بھی ایسا موجود ہے جو کہتا ہے کہ ان کے اس طرز عمل سے ایمان میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام ہے، جب اقرار اور تصدیق اپنی جگہ پر قائم ہیں تو ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوسکتا۔

دوسرا طبقہ زمانہ جدید اور قدیم میں یہ کہتا ہے کہ ان کے اس طرز عمل سے ان کے ایمان میں خلل پیدا ہوجاتا ہے۔ ان لوگوں کی اس مسئلے میں دو رائے ہیں:

پہلی رائے یہ ہے:

ان کے اندر سے ایمان نکل جاتا ہے اور وہ لوگ ایمان والے نہیں رہتے، بلکہ کافر شمار ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح کی رائے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اہل خوارج کی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ جب بندہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے:

ارتکاب معاصی سے بندہ نہ تو ایمان سے خارج ہوتا ہے اور نہ ہی کفر میں داخل ہوتا ہے، بلکہ ایمان اور کفر کے درمیان درمیان رہتا ہے۔ یہ طبقہ معتزلہ کی رائے تھی اور آج کل بھی بعض حضرات ایسے ہیں جو اس قسم کی رائے رکھتے ہیں۔

جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ کی رائے ان دونوں کے خلاف ہے، جس کی وضاحت امام اعظم نے فرمادی ہے کہ معاصی سے ایمان میں فرق نہیں پڑتا، البتہ یقین اور حلاوت ایمانی میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔

دوسری علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں صرف ایک مسئلہ بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ ایمان اور عمل کا تعلق:

نُقِرُّ بِاَنَّ الْعَمَلَ غَیْرُ الْاِیْمَانِ ؛ وَالْاِیْمَانُ غَیْرُ الْعَمَلِ : بِدَلِیْلِ اَنَّ کَثِیْراً مِنَ الْاَوْقَاتِ یَرْتَفِعُ الْعَمَلُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؛ وَلَا یَجُوْزُ اَنْ یُّقَالَ اِرْتَفَعَ عَنْهُ الْاِیْمَانُ

فَاِنَّ الْحَائِضَ وَ النُّفَسَاءَ یَرْفَعُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی عَنْهُمَا الصَّلٰوةَ ؛ وَلَا یَجُوْزُ اَنْ یُّقَالَ رَفَعَ عَنْهَا الْاِیْمَانَ ؛ اَوْاُمِرَ لَهُمَابِتَرْکِ الْاِیْمَانِ ؛ وَقَدْ قَالَ لَهَا الشَّارِعُ : دَعِیَ الصَّوْمَ ثُمَّ اقْضِیْهِ ؛ وَلَا یَجُوْزُ اَنْ یُّقَالَ دَعِی الْاِیْمَانَ ثُمَّ اقْضِیْهِ ؛ وَ یَجُوْزُ اَنْ یُّقَالَ لَیْسَ عَلَی الْفَقِیْرِ الزَّکٰوةِ ؛ وَلَا یَجُوْزُ اَنْ یُّقَالَ لَیْسَ عَلَی الْفَقِیْرِ الْاِیْمَانُ

اور معلوم ہونا چاہئے کہ عمل علیحدہ چیز ہے اور ایمان علیحدہ ہے۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ کئی بار کسی مؤمن کو عمل کی معافی دے دی جاتی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی عذر میں مبتلاء ہو جائے تو اس کے عذر کی وجہ سے اس کا عمل معاف کر دیا جاتا ہے، مگر ایمان کے معاف ہونے اور ذمے سے ساقط ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں صورت میں اس شخص سے ایمان ساقط ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر مدت حیض یا مدت نفاس میں مبتلاء عورت کو شریعت کی طرف سے نماز کی ادائیگی تو معاف کر دی جاتی ہے، لیکن اس کو ایمان نہ لانے کی چھوٹ نہیں دی گئی، یا اس

کو اس حال میں ایمان چھوڑنے کا حکم نہیں دیا گیا؛ اور اسی طرح صاحب شریعت نے حیض یا نفاس والی عورت کو روزہ نہ رکھنے کا حکم تو دیا ہے اور بعد میں اس کو قضاء کرنے کی تجویز دی ہے ؛ لیکن اس کو یوں نہیں کہا گیا کہ ایام مخصوص میں وہ عورت ایمان چھوڑ دے اور بعد میں اس ایمان کی قضاء کرلے، اور اسی طرح کسی غریب آدمی پر زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں ہے، لیکن اس صورت میں یوں تو کہا جاسکتا ہے کہ غریب آدمی پر زکوۃ کی ادائیگی فرض نہیں ہے، لیکن اس کو یوں نہیں کہا جاسکتا کہ غریب آدمی پر ایمان بھی لازم نہیں رہا ہے۔

تشریح: ایمان اور عمل کے تعلق کے بارے میں بعض حضرات کا اختلاف ہے جیسا کہ اس سے پہلے مسئلے میں۔اس کی اجمالی طور پر وضاحت پیش کی گئی ہے، لیکن اس مسئلے کو یہاں قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا ایمان اور عمل دونوں لازم وملزوم ہیں یا نہیں۔اس بارے میں کل تین رائے ہیں:

پہلی رائے یہ ہے کہ اعمال، ایمان کے تین اجزاء میں سے تیسرا جزو ہے، پہلا جزو زبان سے اقرار ہے، دوسرا جزو دل سے تصدیق کرنا ہے۔اور تیسرا جزو اعمال کی بجا آوری ہے، اور یہ اختلاف عرب کے اشاعرہ، حنابلہ اور برصغیر کے غیر مقلدین اور بعض جدید معتزلہ حضرات، کا مذہب ہے، اس مذہب کے مطابق اگر کوئی شخص اعمال میں سے کوئی عمل نہ کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے جیسے اگر کوئی نماز نہ پڑھے تو وہ کافر ہو جاتا ہے، ایسے ہی جو حکومت الٰہیہ کے لئے کوشاں نہیں ہوتا وہ کافر ہو جاتا ہے اور ان کے پاس اس بات کی دلیل ارشاد نبوی ہے۔

من ترک الصّلاۃ متعمداً فقد کفر

جو شخص جان بوجھ کر نماز ترک کرتا ہے وہ کافر ہو جائے گا

﴿ومن لم یحکم بما انزل اللہ فأولئک ھم الکافرون﴾

جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے

اور ان کی اس بات کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا مان لیا جائے کہ ترک اعمال سے کفر لازم آنے لگے تو ں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ صرف ہمارے اس عقیدے کے اختیار کرنے سے مسلمانوں کی کثریت کافر ہو جائے گی اور مسلمان اقلیت میں ہو جائیں گے، اس لئے معاشرے میں نمازیوں کی تعداد نچ فی صد بھی نہیں ہے، اسی طرح احکام نافذ کرنے کی استطاعت ایک فی صد لوگوں کے پاس بھی نہیں ہے، لہٰذا جب ایک بات کے ماننے سے پچانوے فی صد مسلمان کافر ہو جائیں تو اس عقیدے کے بارے ں بہت سوچ بچار کی ضرورت ہے۔دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مسلمان کو کافر کہنے ے منع فرمایا ہے۔اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے امام اعظم نے ارشاد فرمایا ''اگر کسی آدمی کی کفریہ ت میں سو میں ننانوے وجوہات کفر کی طرف اور ایک وجہ ایمان کی طرف راجح ہوتی ہو تو بھی اس کو کافر نہ

کہا جائے"، کجایہ کہ ایسا عقیدہ اختیار کیا جائے جس سے ساری امت کو یک قلم کافر قرار دے دیا جائے۔

دوسری رائے یہ ہے

ایمان کے ارکان میں اعمال نہیں ہیں، بلکہ یہ ایمان میں لذت اور چاشنی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، لہٰذا جو شخص جتنا زیادہ اعمال کی بجا آوری کرے گا اس کے ایمان میں اسی قدر زیادہ لذت اور حلاوت ہوگی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدو ا ان لاالہ الااللہ وان محمدا رسول اللہ فاذا قالوھا عصموا منی دمائھم واموالھم الابحق الاسلام

مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ اس وقت تک قتال کروں جب تک وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ نہ کہہ لیں اور جب وہ اس بات کا اقرار کرلیں تو ان کا جان و مال محفوظ ہو جائے گا سوائے اس صورت کے کہ جو کوئی خلاف اسلام جرم کرے اور وہ سزا کا مستوجب ہونے لگے۔

اور جو حدیث معروف گزر چکی ہے جس میں فرمایا:

من ترک الصّلاۃ متعمداً فقد کفر

یعنی جو شخص جان بوجھ کر نماز ترک کرے وہ کافر ہے۔

اس کا جواب یوں ہے: چونکہ حدیث میں الفاظ ہیں متعمدا (جان بوجھ کر) ان الفاظ میں دو مفہوم ہیں پہلا یہ کہ اس سے مراد یہ جان کر کہ نماز نہیں پڑھنی چاہئے اگر کوئی شخص ایسا سوچے تو اس کا ایسا سوچنا کفر ہے۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد ایسا عقیدہ رکھنا کہ نماز پڑھنا یا نماز ہمارے اوپر فرض نہیں ہے، اگر کوئی شخص ایسا اعتقاد رکھے تو اس کا ایسا عقیدہ عقیدہ کفر ہے۔ اور یہی رائے جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کی ہے۔

اور اہل السنۃ والجماعۃ کی رائے یہ ہے کہ ایمان ایمان ہے اور اعمال اعمال ہیں۔ ایمان کا تعلق قلب و ذہن سے ہے جبکہ اعمال کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے، لہٰذا ایمان اور اعمال دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک ایمان کے دو ارکان ہیں زبان سے اقرار، اور دل سے تصدیق کرنا اور یہ دونوں باتیں اصل میں ایک ہی ہیں، جبکہ اعمال الگ چیز ہیں اور ان کی ادائیگی اعضاء و جوارح سے ہوتی ہے اس لئے اس کو ایمان کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی تفصیل اوپر متن میں حضرت امام اعظم نے بڑے احسن اور خوبصورت انداز میں پیش کردی ہے۔ یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف ہے، اس لئے ہمارے نزدیک ایمان لانے کی بنیاد کلمہ کا اقرار ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مفتاح الجنۃ لاالہ الا اللہ

جنت کی چابی لا الہ الا اللہ ہے

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کلمہ پڑھ لیتا ہے اور اس کا یہ عمل زبان و دل دونوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ مسلمان سمجھا جائے گا، اسی مضمون سے موافقت رکھنے والی بے شمار احادیث ہیں جن میں بخشش کا معیار

زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کو قرار دیا گیا ہے، اور کہیں بھی ایمان کے لانے کے ساتھ فرائض وارکین کی ادائیگی کو لازم وملزوم نہیں ٹھرایا گیا

اور یہی رائے حضرت امام اعظمؒ کی ہے، جس پر اُوپر متن میں تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ:

اس بارے میں سکوت اختیار کیا جائے اور اس کے متعلق کوئی رائے بھی نہ دی جائے۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک جب کوئی شخص یہ سوال کرے کہ ایمان کے ارکان تین یا چار ہیں؟

تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اور یہی ان کا کل مبلغ علم ہے اور یہی ان کے علم وعمل کا خلاصہ ہے۔

☆☆☆

تیسری علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں سات مسائل بیان فرمائے گئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے

پہلا مسئلہ اچھی اور بری تقدیر کا بیان:

نُقِرّ بِاَنَّ تَقْدِیْرُ الْخَیْرِ وَالشَّرِّ کُلّه مِنَ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالیٰ لِقَوْلِه تَعَالیٰ:

﴿قُلْ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾(النساء: ۷۸)

وَلَوْ زَعَمَ اَحَدٌ اَنَّ تَقْدِیْرَ الْخَیْرِ وَالشَّرِّ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ تَعَالیٰ لَصَارَ کَافِراً بِاللّٰهِ تَعَالیٰ؛ وَبَطَلَ تَوْحِیْدُهٗ لَوْ کَانَ لَهُ التَّوْحِیْدَ؛ وَقَالَ تَعَالیٰ ﴿وَکُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَکَبِیْرٍ مُسْتَطَرٌ﴾

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہر اچھی اور بری تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ (خیر اور شر) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے"

اور جو شخص اچھائی یا برائی کے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہونے کا قائل ہو اور وہ یوں کہے کہ:

"اچھی تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور بری تقدیر کسی اور کی طرف سے ہے"

تو وہ شخص اگر ایمان والا ہو تو کافر ہو جائے گا؛ اور اس کا عقیدۂ توحید بھی باطل اور اس

کا ایمان بھی زائل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''ہر بات جو انسان سرانجام دیں گے ان کے صحیفوں میں موجود ہیں،
اور ہر چھوٹی بڑی بات اس میں لکھی جا چکی ہے''

تشریح: پہلا مسئلہ: اچھی اور بری تقدیر کے بیان میں

پہلے مسئلہ میں ہمارے ساتھ بعض فرقوں نے اختلاف کیا ہے اس کی تفصیل یوں ہے:

(۱): ہمارے نزدیک خیر ہو یا شر، اچھائی ہو یا برائی، نیکی ہو یا بدی سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوتا ہے

(۲): بعض مذاہب اور بعض فرقوں نے اس سلسلے میں ہم سے اختلاف کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ خیر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن شر کا ظہور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا اور اصل بات یہ ہے کہ اس کام کے صادر ہونے کے لحاظ سے کون سی طاقت استعمال ہوتی ہے، اس کے بارے میں مختلف رائے ہیں، اس کے بارے میں بعض لوگوں نے اس کو اپنے نفس کی طرف منسوب کیا ہے، اور بعض حضرات نے اس کو کسی دوسرے خدا کی طرف منسوب کیا ہے، اور بعض لوگ اس کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جبکہ اس کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور طاقت کی طرف کسی کام کے واقع ہونے کی نسبت کرنا سراسر شرک بن جاتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے عقائد سے ہماری حفاظت فرمائے۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں یوں ارشاد فرمایا:

بان الله تعالى قدر الخير والشر قبل خلق الخلائق؛ وان جميع الكائنات متعلق بقدره؛ وهو عند السلف من الصفات المتشابهة؛ اشارات المرام: ٦٢

یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تخلیق سے پہلے ہر ایک چیز کی تقدیر کو مقدر کر دیا تھا، اور ساری کائنات اسی کی قدرت کے تابع ہے اور یہ صفات اللہ تعالیٰ کی متشابہ صفات میں سے ایک ہے جس کو سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی صحیح معنوں میں سمجھ نصیب فرمائیں....آمین

یہی وجہ ہے کہ فرائض ہوں یا فضائل یا معاصی سب کے وقوع پذیر ہونے میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر شامل ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا حکم، اس کے علم کے موافق ہونے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کے اس عمل کو پیدا کئے جانے کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اعمال کی اقسام کے بیان میں:

نُقِرُّ بِاَنَّ الْاَعْمَالَ ثَلٰثَةٌ : ۱۔ فَرِيْضَةٌ ۲۔ وَ فَضِيْلَةٌ ۳۔ وَ مَعْصِيَةٌ

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انسان سے جو کام بھی صادر ہوتے ہیں شرعی لحاظ سے ان کی تین قسمیں ہیں:

۱-فرائض ۲-فضائل ۳-معاصی

تشریح: دوسرا مسئلہ، پہلی بات احکام شرعیہ کی حقیقت: احکام شرعیہ کی صورت حال دو حال سے خالی نہیں ہے کیونکہ ان اعمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے باز پرس ہوگی یا نہیں ہوگی؟

اگر باز پرس ہونے کا یقین ہو تو اس قسم کے وقوع فعل کو فرائض کہتے ہیں اور اسی اعتقاد کے ساتھ اس فعل کے ترک کردینے کو معاصی کہتے ہیں۔

اور اگر ان اعمال پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باز پرس کا اعتقاد نہ ہو، البتہ ان کا صادر ہونا اجر ربانی کا باعث بنے، اس کو فضائل کہتے ہیں۔

اور اگر ان پر اجر کی بجائے مؤاخذہ یا سزا کا اندیشہ ہو تو اس کو مکروہ کہتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ فرائض کے بیان میں:

۱ : فَالْفَرِيْضَةُ : بِأَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى ، وَمَشِيَّتِهٖ ، وَمُحَبَّتِهٖ ، وَرَضَائِهٖ ، وَقَضَائِهٖ ، وَقَدْرِهٖ ، وَ اِرَادَتِهٖ ، وَتَوْفِيْقِهٖ ، وَتَخْلِيْقِهٖ ، وَحُكْمِهٖ ، وَ عِلْمِهٖ ، وَكِتَابَتِهٖ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ .

ترجمہ: فرائض سے مراد انسانوں سے صادر ہونے والے وہ اعمال ہیں جن کا ادا کرنا لازم ہوتا ہے؛ اور ان فرائض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو صفات بندوں کے شامل حال ہوتی ہیں ان کی تفصیل یوں ہے

(۱) اللہ تعالیٰ کے 'امر' سے ان کاموں کی ادائیگی ہوتی ہے (۲) اور اللہ تعالیٰ کی 'مشیت' ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ (۳) اور اللہ تعالیٰ کی 'محبت' شامل ہوتی ہے۔ (۴) اور اللہ تعالیٰ کی 'رضا' شامل ہوتی ہے۔ (۵) اس قسم کے عمل، اللہ تعالیٰ کے 'فیصلے' کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں۔ (۶) اور اللہ تعالیٰ کی 'تقدیر' سے صادر ہوتے ہیں۔ (۷) اور ان کے صادر ہونے میں اللہ تعالیٰ کا 'ارادہ' شامل ہوتا ہے۔ (۸) اور اس قسم کے اعمال اللہ تعالیٰ

کی 'توفیق' سے صادر ہوتے ہیں۔ (۹) اور اللہ تعالیٰ کے 'پیدا' کیے جانے کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ (۱۰) اور اللہ تعالیٰ کے 'حکم' سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ (۱۱) اور اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ہونے کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ (۱۲) اور لوحِ محفوظ میں لکھے جانے کی بناء پر صادر ہوتے ہیں۔

اور جو اعمال مذکورہ صورت میں صادر ہوں وہ شریعت اسلامیہ میں فرائض کا درجہ رکھتے ہیں:

تشریح: تیسرا مسئلہ فرائض کی حقیقت

فرائض ان اعمال کو کہتے ہیں جو دلیل قطعی سے ثابت ہوں اور جس کے سمجھنے میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو اور شریعت میں اس کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کو بلاوجہ ترک کردے تو اس کی مذمت کی جائے گی۔ اس کی پھر چار اقسام ہیں:

فرائض کی اقسام: اصطلاح شرع میں فرض کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) جو مطلق طور پر دلیل قطعی سے ثابت ہو وہ فرض قطعی ہوتا ہے۔ (۲) اور جو ثابت تو دلیل قطعی سے ہو، لیکن اس کی حدود کسی مجتہد کے اجتہاد سے ہوتی ہوں اس کو فرض ظنی کہتے ہیں جیسے وضو میں مسح کرنا تو فرض ہے، لیکن اس کی مقدار کتنی ہے یہ فرض ظنی ہے۔ (۳) اور ہر ایسا فرض جو تمام انسانوں پر ایک جیسی فرضیت کا حکم رکھتا ہو اس کو فرض عین کہتے ہیں۔ (۴) اور جس فرض کی فرضیت مخصوص حالات یا مخصوص اوقات یا مخصوص افراد پر ہو، اس کو فرض کفایہ کہتے ہیں۔ اور یہاں امام اعظم نے مطلق فرض کی حکمیت کو بیان کیا ہے۔

چوتھا مسئلہ فضائل کے بارے میں:

۲- والفَضِيلَةُ : لَيسَتْ بِأَمْرِ اللهِ تَعَالَى ، وَلكِنْ بِمَشِيّتِهِ ، وَمُحَبَّتِهِ وَقَضَائِهِ ، وَرَضَائِهِ ، وَقَدْرِهِ ، وَتَوفِيقِهِ ، وَتَخْلِيقِهِ ، وَحُكْمِهِ ، وَعِلْمِهِ، وَكِتَابَتِهِ فِي اللَّوحِ الْمَحْفُوظِ ؛ .

ترجمہ: اسلامی شریعت میں فضائل سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے صادر ہونے میں اللہ تعالیٰ کی مندرجہ ذیل صفات شامل ہوتی ہوں:

(۱) جو کام اللہ تعالیٰ کے 'امر' کی وجہ سے صادر نہ ہو۔ (۲) بلکہ اللہ تعالیٰ کی 'مشیت' کی بناء پر وقوع پذیر ہو۔ (۳) اور اس کے صادر ہونے میں اللہ تعالیٰ کی 'محبت' بھی شامل ہو۔

(۴) اور اللہ تعالیٰ کے 'فیصلے' کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (۵) اور یہ کام اللہ تعالیٰ کی 'قضاء' کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ (۶) اور ان کے ظہور میں آنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی 'رضا' شامل ہو۔ (۷) اور اللہ تعالیٰ کی 'قدرت' سے صادر ہوتے ہوں۔ (۸) اور اس قسم کے کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'توفیق' کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں۔ (۹) اور وہ کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'پیدا' کئے جانے سے صادر ہوتے ہیں۔ (۱۰) اور اللہ تعالیٰ کا 'حکم' ان کاموں کے معرض وجود میں آنے کا باعث ہو۔ (۱۱) اور اس قسم کے کام اللہ تعالیٰ کے 'علم کامل' میں ہونے کی وجہ سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ (۱۲) اور یہ کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'لوحِ محفوظ میں لکھے' ہونے سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

جو کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذکورہ بالا تمام صفات پر مشتمل ہونے کی بناء پر صادر ہوں ان کو اسلامی شریعت میں 'فضائل' کہتے ہیں۔

تشریح: مسئلہ چہارم فضائل کی حقیقت

فضائل فضیلت کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ اعمال ہیں جن کے سرانجام دینے سے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب ملتا ہے اور بلا وجہ اس کے مطابق عمل نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہوگی اور اس کا ثبوت یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال سے ہوتا ہے یا خلفائے راشدین سے ہوتا ہے۔ اب دیکھا یہ جائے گا کہ اگر عبادات کی قسم میں سے کوئی عمل ان شخصیات سے تواتر کے ساتھ اور (Ragulerly) عمل میں آیا ہو، اور اس قسم کے عمل کا شمار واجبات میں بھی نہ ہو تو اس کو سنت مؤکدہ کہتے ہیں اور اگر وہ کام از قسم علاوہ عبادات کے کوئی اور کام ہو تو اس کو سنن ہدیٰ کہتے ہیں۔

اور اگر اس کے مطابق عمل کرنے سے ثواب تو ملتا ہو، لیکن اس کے مطابق عمل نہ کرنے سے گناہ نہ ملتا ہو اس کی دو قسمیں ہیں: عبادات میں سے کوئی کام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر مواضبط کے ساتھ عمل میں آتا رہا تو اس کو مندوب اور مستحب کہا جاتا ہے اور عبادات کے علاوہ ہو تو اس کو سنن زوائد کہتے ہیں اور وہ کام جن کا اختیار کرنا ثواب ہے اور ترک پر کوئی سزا نہیں ہوتی اس کو احکام شرعیہ میں نفل کہتے ہیں۔

پانچواں مسئلہ لوح وقلم پر ایمان:

فَنُؤْمِنُ بِاللَّوْحِ وَ الْقَلَمِ ؛ وَ بِجَمِيعِ مَا فِيهِ قَدْ رُقِمَ وَرُسِمَ

ترجمہ: بس ہم لوحِ محفوظ پر، اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق قلم پر ایمان لاتے ہیں، اور اسی

طرح ان دونوں (لوح وقلم) کے ساتھ جو کچھ لکھا، یا لکھوایا گیا اور تحریر میں لایا گیا ہم ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

تشریح: مسئلہ پنجم: قلم اور لوح کی حقیقت، اور ان کی لکھائی کی کیفیت

قلم اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے؛ جس میں اللہ تعالیٰ نے ضروری علوم کے لکھنے کی استعداد کو پیدا کر دیا تھا؛ اس قلم کی حقیقت ملائکہ کی طرح ایک جسمِ نورانی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے علم اور قوت اور ادراک اور فہم واستفہام کی تمام استعداد رکھ دی تھی؛ اور اللہ تعالیٰ نے اسی استعداد کے ساتھ قلم کو سب سے پہلے پیدا فرمایا؛ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

اوّل ماخلَق اللّٰہ القَلَم ، فَقَال لہٗ : اُکتُب ! فقال ماذا اکتُبُ یا ربی؟ فقال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ: اُکتُبِ القدرَ ماکانَ وَمَاھُو کَائنٌ اِلَی الْاَبَدِ

(أخرجه الترمذی: ۲۰۸۱)

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا پھر اس کو کہا لکھ؟ اس نے استفسار کیا:

میں کیا لکھوں اے میرے پروردگار؟

اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: تقدیر کے سارے معاملات لکھ دو۔ اور جو کچھ ابد الآباد تک ہونا ہے، اس کو بھی لکھ دو۔

وفی روایۃ (فکتب القلم) مَن استسلم بقضائی، ویصبر علی بلائی ، ویشکر علی نعمائی کتبتہ وبعثتہ صدیقین یقیناً؛ ومن لم یرض بقضائی ، ولم یصبر علی بلائی ولم یشکر علی نعمائی ولیخرج مِن أرضِیْ وَسَمَائِی ، وَلیَتَّخِذْ ربّاً سَوائِی؛

(اور ایک روایت میں ہے اس کے بعد قلم نے سب سے پہلے جو لکھا وہ یوں تھا)

جو میری قضاء وقدر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے، میری طرف سے پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کرے، اور میری نعمتوں پر شکر کرتا ہو، تو میں ان کے سچے صدیقین میں سے ہونے کا فیصلہ لکھ دیتا ہوں اور جو بندہ میری قضاء وقدر پر راضی نہیں ہوتا، اور میری طرف سے وارد ہونے والی بلاؤں اور مصیبتوں پر صبر نہیں کرتا اور میری نعمتوں پر شکر نہیں کرتا، اس کو چاہئے کہ میرے اس آسمان وزمین میں سے نکل جائے، اور میرے علاوہ کسی اور کو اپنا پروردگار رب بنا لے۔

اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قلم نے لوح محفوظ میں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات سمیت لکھ دیا ہے۔

نوٹ: لوح محفوظ کی لکھائی کا بیان۔

لکھائی سے مراد یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ بھی لکھا گیا تھا وہ نہ تو انسانی تحریر کی مانند تھا؛ اور نہ عددی انداز میں تھا اور نہ ہی وہ کوئی خفیہ اشاروں (secret code) میں تھا، جیسے آجکل کمپیوٹر خفیہ کوڈز

(codes) میں کام کرتا ہے؛ اور نہ ہی لوح محفوظ میں لکھائی کا کوئی اور ایسا طریقۂ کار تحریر تھا جو ہزاروں سال قبل یا ہزاروں برس بعد کے انسان استعمال کرتے یا کریں گے؛

اور لوحِ محفوظ بھی اسی طرح اللہ کی نورانی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے؛ اس میں بذاتِ خود کوئی صلاحیت نہیں کہ اپنی مرضی سے کوئی نہ ہو سکنے والی بات کر سکے؛ یا نہ ہونے والا کام از خود کر دیں؛ کوئی بھی بات اس کے اختیار کی حدود میں نہیں اور نہ ہی اس کی طاقت مین ہے؛ بس اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے جو ان پر جاری وساری اور حاوی ہو چکی اور ہوتی رہتی ہے۔

ایک بات واضح ہونی چاہئے کہ: قلم کو دنیا میں انسان کے بنائے ہوئے قلم کی مانند اور لوح کو انسانی الواح یا (note book) کی مانند نہ سمجھنا چاہئے، بلکہ وہ ان سے یا ان کی مثل بننے یا ہونے سے بھی پاک ہے؛ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بنایا اور جو حکم فرمایا وہ اسی کے حکم کی تعمیل میں لگے ہوئے ہیں؛ البتہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات کسی مخلوقات کا تذکرہ یا ان کے نام اسی انداز سے ارشاد فرماتے ہیں جیسے ہم دنیا میں ان کو استعمال کرتے ہیں یا جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اس عمل سے صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ انسانوں کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

چھٹا مسئلہ معاصی کے بیان میں:

۳ : وَالْمَعْصِيَةُ : لَيْسَتْ بِأَمْرِ اللّٰهِ ، وَ لٰكِنْ بِمَشِيَّتِهٖ ، لاَ بِمُحَبَّتِهٖ ، وَ بِقَضَائِهٖ ، لاَ بِرَضَائِهٖ ، وَ بِتَقْدِيْرِهٖ ، وَ تَخْلِيْقِهٖ ، لاَ بِتَوْفِيْقِهٖ ، وَإِرَادَتِهٖ وَحُكْمِهٖ ، وَعِلْمِهٖ ، وَ بِخُذْلاَنِهٖ ، لاَ بِمَعْرِفَتِهٖ ، وَ بِكِتَابَتِهٖ فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ .

ترجمہ: معاصی سے مراد وہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مندرجہ ذیل صفات کی بناء پر صادر ہوں:

(۱) اور وہ کام اللہ تعالیٰ کے 'امر' سے صادر نہیں ہوتے۔ (۲) لیکن ان کے وجود میں آنے میں اللہ تعالیٰ کی 'مشیت' شامل حال ہوتی ہے۔ (۳) اور ان کاموں کے ظاہر ہونے میں اللہ تعالیٰ کی محبت شامل نہیں ہوتی۔ (۴) البتہ اس کی قضاء سے وہ عمل معرض وجود میں آتے ہیں۔ (۵) ان کاموں کے واقع ہونے میں اللہ تعالیٰ کی رضاء شامل حال نہیں ہوتی۔ (۶) البتہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر بندوں کے شامل حال ہوتی ہے۔ (۷) اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کئے جانے کی وجہ سے وہ کام صادر ہوتے ہیں۔ (۸) البتہ اس قسم

کے کام کے صادر ہونے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل عمل نہیں ہوتی۔(۹)ان کاموں کے صدور میں اللہ تعالی کا ارادہ شامل ہوتا ہے۔(۱۰)اوراس کے حکم کی وجہ سے وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔(۱۱)اور اللہ تعالی کے علم کے مطابق ان کا عملی ظہور ہوتا ہے۔(۱۲)اور اس قسم کے عمل صادر ہونے میں اللہ کی ناپسندیدگی شامل ہوتی ہے۔(۱۳)البتہ اللہ تعالی کی معرفت اس کام کے ظہور میں شامل نہیں ہوتی۔(۱۴)اور اس قسم کے تمام اعمال لوحِ محفوظ میں لکھے جانے کی وجہ سے عمل پذیر ہوتے ہیں۔

تشریح: مسئلہ ششم: معاصی کی حقیقت

معاصیت اللہ تعالیٰ کے کسی بھی منع کردہ کام کو اختیار کرنے کا نام ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔اگر تو اس کے منع کرنے پر نص قطعی ہو تو اسکو حرام کہا جائے گا اور اگر اس کے حرام ہونے پر مجتہد کا اجتہاد دلیل بنا ہو تو اس کو مکروہ تحریمی کہتے ہیں اور اگر اس کی کراہت کسی دلیل ظنی کی وجہ سے ہو تو اس کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں، جیسے نماز کے دوران لہسن وغیرہ کا استعمال کرنا نماز میں بدبو سے دوسرے نمازیوں اور ملائکہ کو اذیت کی وجہ سے کراہت ہے، بذات خود حرام نہیں۔

ساتواں مسئلہ انسانوں کے اعمال میں مؤاخذے کی وجہ

وَ الْمُؤَاخَذَةُ عَلَيْهِ لِكَوْنِهٖ فِعْلَ الْعَبْدِ

اوران کاموں کے صادر ہونے پر اللہ تعالی کی طرف سے موٴاخذہ اس وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ ان کاموں کے صدور میں انسان کا پورا عمل دخل ہوتا ہے۔

تشریح: مسئلہ ہفتم مؤاخذہ انسانی

انسانوں کے اللہ تعالی کی طرف سے مؤاخذہ ہونے کے بارے میں چھ رائے ہیں

پہلی رائے یہ ہے کہ انسان چونکہ مجبور محض ہیں، لہذا اس سے کسی بھی قسم کا حساب وکتاب لیا جانا بے کار ہے بس اس سے کوئی حساب نہیں ہوگا، بلکہ اس سے حساب لیا جانا اس پر ظلم ہے کیونکہ پہلے اس کو ایک کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور بعد میں اس سے محاسبہ کیا جارہا ہو یہ سراسر ظلم ہے، یہ رائے جبریہ کی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال میں مختار کل ہے وہ جو چاہے اور جیسے چاہے کام کرے اس سے اس کے اعمال کے بارے میں اس سے ضرور باز پرس ہوگی، لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ جب بندہ اپنے اختیار سے کوئی کام سرانجام دیتا ہے تو اس کی باز پرس کا کیا مطلب ہوا، یہ رائے بھی احکام شرعیہ کے اصول وفروع سے موافقت نہ کرنے کی بناء پر ناقص ہے اور اس رائے کے قائل فرقہ قدریہ اور

بعض جدید فرقے ہیں۔ چونکہ موجودہ دور تشتت اور افتراق اور انتشار کا دور ہے، اس لئے کسی فرقے کی تعین نہیں کی جاسکتی کیونکہ ایک وقت میں ایک فرقے کی ایک رائے ہوتی ہے، دوسرے وقت میں وہ اپنی رائے سے پھر جاتا ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ انسان کے اعمال کی جزا وسزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم ہے کہ وہ اپنے عدل کے مطابق کرے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو عادل کہا ہے، لہٰذا عدل کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے اور یہ رائے اہل تشیع کی ہے اسی لئے ان کے اصول ایمان میں سے ایک اصول عدالت بھی ہے۔

چوتھی رائے وہ چاہے تو معاف فرمادے اور چاہے تو گرفت کرلے یہ رائے اہل السنّت والجماعت کی ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے اس کی مرضی اور حکم ہر چیز پر غالب ہے۔ وہ جو چاہے فیصلے فرمائے کوئی اور طاقت اس کے اوپر حاکم و غالب نہیں ہے، لہٰذا اس کا کیا ہوا ہر حکم اور اس سے ہو چکا۔ ہر فیصلہ اسی کی مرضی اور تقدیر کے تابع ہے اور کوئی نہیں جو اس پر غالب و حاکم ہو۔ اس لئے عدل بھی اسی کی طرف سے ہے ''اگر کسی آدمی کی ساری زندگی کی نیکیوں کے بدلے میں اس کو جہنم میں ڈال دے یا کسی آدمی کی ساری زندگی کی بدکاریوں کی وجہ سے اس کو جنت میں بھجوادے، وہی اس کا عدل ہے''۔

اس لیے عارف باللہ حضرت سلطان باہو نے فرمایا:

عدل کریں، تے تھر تھر کمبن ، اُچیاں شاناں والے، ہو
فضل کریں ، تے بخشے جاون، میں ورگے منہ کالے، ہو

اور بندہ اس کے بارے میں عرض پرداز ہے۔

عدل تیرا ہے، خوف خدایا ،ڈرتا اس سے ہر کوئی
فضل ترے کی ، بات نرالی ،چاہت ہے وہ سب کی

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہم اہل السنّت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر کوئی اور ذات ایسی نہیں جو اس پر حاکم ہو، بلکہ وہی ذات ہے جو اپنے ہر کام کی خود حاکم ہے۔

پانچویں رائے: اس رائے کے قائلین کا یہ کہنا ہے کہ انسان اپنے اعمال کی وجہ سے دوبارہ اسی دنیا میں لوٹ آتا ہے اور اس کو اس کے اعمال کی مناسبت سے ایک نیا وجود دیا جاتا ہے لہٰذا جتنے جانور اور جاندار ہمیں نظر آتے ہیں وہ اس نقطہ نظر کے مطابق ایک وقت تھا جب انسان تھے، لیکن اپنے اعمال کی بدی کی وجہ سے وہ جانور بنادئے گئے یا ان کو ملائکہ یا اونچے درجے پر فائز کردیا گیا۔ اس قسم کے عقائد رکھنے والے لوگ قیامت یا اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے یا اس کی طرف سے حساب وکتاب اور بطور انعام جنت ودوزخ کے قائل نہیں ہیں۔

چھٹی رائے: یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب اتفاقی اور حادثاتی طور پر پیدا ہوگیا ہے لہذا دنیا میں کسی کو اس کی اچھائی کا بدلہ یا اس کی برائی کی سزا، اس دنیا میں اگر مل جاتی ہے تو اس عمل کی جزا یا سزا بس اتنی ہی ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا جہاں یا کوئی جزا وسزا کا مقام نہیں ہے جہاں لے جاکر انسانوں

کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا اور اس کے بعد ان کے اعمال کا ان کو بدلہ دیا جائے گا۔ اس قسم کی سوچ رکھنے والے لوگ دہریہ کہلاتے ہیں۔

نوٹ: دہریت کا مختصر تعارف

اس کتاب کا موضوع چونکہ علم عقائد ہے اور اس کے برعکس جو مکتبہ فکر ہے اس کا نام دہریت ہے، لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مختصر سا تعارف پیش کر دیا جائے تا کہ علم عقائد کے طلبائے علم کو اس بات سے آگاہی ہو جائے کہ ان کا اصل مدمقابل کون ہے؟ اس کو اگر اپنے افکار کسی کے سامنے پیش کرنے ہیں، یا کسی کی تنقید کا جواب دینا ہے تو وہ کون لوگ؟ اور ان کے کیا نظریات ہیں؟

اس کے بارے میں برصغیر پاک وہند کے عظیم فلسفی حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے خانوادۂ علمی کے چشم و چراغ، علامہ قاضی قیصر الاسلام فرماتے ہیں:

''دہریت کسی دبستان فکر کا نام نہیں، بلکہ یہ نفس انسانی کا ایک ایسا رجحان ہے جس کے آثار وعلامات ہمیں تاریخ کے ہر دور میں ملتے ہیں۔ یونانیوں میں حتی کہ قرون وسطی کے دور میں بھی یہ رجحان موجود تھا اور دور جدید میں جبکہ سائنسی معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، غالباً یہ فلسفیانہ رجحان بھی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بنیادی طور پر دہریت مابعد الطبعیات کا وہ نظام فکر ہے جس کے نزدیک فطرت ہی، کل حقیقت ہے۔ اور ہمیں فطرت کے نظام کی توضیح و تشریح کے لئے کسی مافوق الفطرت ہستی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برعکس مذاہب میں ایسی مافوق الفطرت قوتوں اور ان کی ماہیت سے بحث ہوتی ہے۔ مختلف ادوار کے دہریوں نے مذہب کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ دہری فلسفیوں کی ساری شدت ہی مذہب کے خلاف ان کے سلبی طریقہ فکر (Negative method) میں ہے۔

دہریت کے نزدیک ہماری نظر کے سامنے جو دنیا ہے اس کے ماوراء کوئی عالم نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کوئی خدا اپنا وجود نہیں رکھتا۔ چنانچہ ایسے مذہبی نظریات مثلاً: روح، حیات بعد الموت، اور دیگر مذہبی نظریات کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ فطرت کے باقاعدہ نظام میں کوئی خارجی مداخلت ممکن نہیں۔ اور اسی لئے معجزات اور قادر مطلق جیسے تصورات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دہریوں کے نزدیک فطرت کے اندر جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں ان کے علل واسباب بھی فطری ہوتے ہیں۔ اس طرح پر قوانین فطرت ہی ایک آفاقی حیثیت رکھتے ہیں اور اصولی طور پر فطرت کی کوئی بھی ایسی چیز ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں جو کہ قوانین فطرت سے ماوراء ہو'' فلسفے کے بنیادی مسائل: ۳۸۲

قاضی صاحب مزید فرماتے ہیں:

''زمانہ حال کے دہریوں نے اپنا نظریہ کائنات، کردار کو عقل کے مطابق بنانے میں صرف کیا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کا ''مبادی اخلاق'' اس سلسلے کا ایک معرکۃ الاراء مقالہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو صرف اس صورت میں مسرت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ فطرت کے ارتقائی رجحان کے ہم آہنگ ہو، اور فطرت کے دوش بدوش قیام و ترقیٔ حیات میں تعاون کرے۔ اس کے معنی ہیں حفظان صحت اور قوائے

نفسیہ کی مقدور بھر ترقی، اس کے معنی ہیں جنگ وجدل اور تمام کشاکش حیات کا ازالہ، جس سے دونوں حریفوں کی زندگی کم اور قوت ضائع ہوتی ہے۔ اس کے معنی فوجی سماج کی بجائے تجارتی سماج کا قیام ہے۔ اس کے معنی ہیں ہمیں سماج میں آزاد مسابقت کی ترویج، تا کہ بہتر سے بہتر آدمی سماج کے اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچ کر آپ اپنا 'فوق البشر' (Super Man) بن جائے۔ اس کے معنی ہیں ہمدردی کی حدود میں توسیع تا کہ دوسروں کی خوشی سے خوش ہوسکیں اور خود غرضی اور ایثار کے ڈانڈے کچھ اس طرح مل جائیں کہ صدیوں کی سماجی وعمرانیاتی گھٹن و بے چہرگی، پری چہری نفوس میں متبدل ہو جائے۔

نیطشے (Nietzsche) ان ہی مقدمات سے کچھ دوسرا نتیجہ نکالتا ہے، اس کے خیال میں اسپنسر کا مطمح نظر پست وحقیر نوعیت کا ہے وہ کہتا ہے کہ: 'فطرت کی ارتقاء پسندی تسلیم، لیکن اسکا طریقہ کار غیر موزوں ہستیوں کو مٹا دینا ہونا چاہئے۔ مسیحیت نے انسانیت کو رحم وکرم کی تعلیم دے کر برباد کر دیا۔ نیطشے کہتا ہے کہ ''اے لوگو! خدا مر چکا ہے اور اب ہر کام کے لئے صلائے عام ہے۔'' وہ پھر یہ اعلام کرتا ہے کہ بجائے ان اصولوں کے کہ ہم دوسروں کو بھی اپنی طرح پیار کریں، ہم کو اپنے ساتھ بھی اسی طرح سخت گیری سے کام لینا چاہئے جیسے دوسروں کے ساتھ ہمارا رویہ ہوتا ہے۔ کیونکہ 'فوق البشر' (Super Man) کا ظہور نااہلوں کے نیست ونابود ہونے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ نااہل کی عین نیکی اس امر میں ہے کہ وہ اپنے سے بہتر کے سامنے جھک جائے۔ بے رحمانہ خود اختیاری ہی مسرت کی راہ مستقیم ہے۔ ہمت ہی حیات ہے جو حیات کی قطع برید کی پرواہ نہیں کرتی۔

ہر چند کہ نیطشے یہ بہ بانگ دہل کہا کرتا تھا کہ: ''خدا مر چکا ہے اور اب ہر کام کے لئے صلائے عام ہے۔'' تاہم فطرت پرستی یا فطری رجحانات میں فی نفسہ کوئی برائی نہیں۔ شرم ولحاظ کو بالائے طاق رکھ دیجئے، قواعد وضوابط کی ساری بندشیں ڈھیلی کر دیجئے۔ ایک آزاد انسان کی اخلاقیات۔ 'اظہار باطن کی اخلاقیات کا ایک مظاہرہ ہے'

الغرض دہریوں کے ضابطۂ اخلاق بدلتے رہتے ہیں، پھر بھی دہریت اخلاق کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑ دیتی۔ دہریت انسان کو سور خانے کی جانب نہیں لے جاتی اور نہ ہی سماجی ترقی کی سوئی کو الٹا گھماتی ہے۔ ہاں اگر اس میں کچھ کمی ہے تو وہ ہے دوام وہمیشگی کے دلفریب مناظر اور عمیق قلب میں یاد خدا کی رمق کی۔ گویا دہریت کائنات کی سولی پر، انسان کے جرائت مندانہ اشارہ ہے جو اس کے سارے اعمال کی میزان کی جگہ صفر لگا دیتا ہے'' فلسفے کے بنیادی مسائل: ۳۸۸

اگر چہ دنیا میں خدا کا انکار کرنے والے متعدد فرقے ہیں اور ان سب کا جو اصولی اختلاف ہے وہ اس دنیا کی زندگی، اور اس کی حقیقت کے بارے میں ہے، ورنہ مذہب اور خدا کی مخالفت کے ساتھ ساتھ آخرت کی زندگی اور مرنے کے بعد کے سب واقعات کے بارے میں ان سب کا ایک سا ہی نقطہ نظر ہے، جو ان شاء اللہ مذکورہ پیراگراف کو اچھی طرح پڑھ لینے کے بعد ان سب کے مبادی اور اصولوں سے آگاہی کا موجب بن سکتا ہے۔

چوتھی علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں دو مسائل بیان فرمائے گئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا عرش پر استویٰ

نقرُ بِأَنَّ اللہ تعالیٰ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ، مِنْ غَیرِ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ حَاجَۃٌ اَوْاِسْتِقْرَارٌ عَلَیْہِ

ترجمہ: ہم اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش بریں پر مستوی ہیں، اگرچہ اللہ تعالیٰ کو عرش پر مستوی ہونے کی نہ تو کوئی حاجت ہے اور نہ ضرورت اور نہ ہی اللہ تعالی کے عرش پر مستوی ہونے کی کوئی خاص کیفیت ہے اور نہ ہی کوئی مخصوص طریقہ ہے۔

تشریح: پہلا مسئلہ: عرش پر استوائے باری

عرش پر استوئے باری تعالی، ان صفات میں سے ایک خاص صفت ہے جو اللہ تعالی کی دوسری صفات کی مانند ہے، اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے علامہ محی الدین اپنی معروف تصنیف القول الفصل میں فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالی کی سات صفات ذاتیہ کے علاوہ ایک صفت ہے اور اس کی حقیقت جاننا مشکل ہے اس لئے کہ یہ صفت متشابہات میں سے ہے۔

اور ہم اس استوی سے استوائے جسمانی مراد نہیں لے سکتے۔ اس لئے کہ استوی کی دلالت وضعیہ اولیہ اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اس سے استوائے جسمانی مراد نہ لیا جائے کیونکہ لفظ 'استوی' کی وضع، واضع نے استوائے جسمانی کے لئے کی ہے، اور اللہ تعالی کے استوی کے لئے کوئی مستوی ہونا لازم ہے جو ذات باری میں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس 'لفظ استوائے باری' کی وضع ہی اس کام کے لئے نہیں ہے۔

اور بعض حضرات نے استوی سے مراد استیلاء لیا ہے اور اس کی تاویل صفت قدرت کے ساتھ کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ عربی محاورے میں کہا جاتا ہے

" قد استوی بشر علی العراق من غیر سیف ودم ھراق "

ایک آدمی بغیر تلوار چلائے خون بہائے عراق پر قابض ہو گیا۔

اور یہ معنی لینا درست نہیں ہے کیونکہ یہ تو اس وقت ہوتا ہے جب کائنات کا مالک کوئی اور ہو اور اللہ تعالیٰ اس پر قبضہ کرلیں جبکہ اللہ تعالیٰ بذات خود کل کائنات کے اصلی مالک ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا قبضہ از خود حاصل ہے اور اس کے لئے صرف استوائے عرش کا ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

اور بعض حضرات نے اس استوی سے ارادہ مراد لیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

﴿ثم استوی الی السماء﴾

تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اس آیت میں استوی کا معنی ارادہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لفظ استوی کو علی کے ساتھ متعدی کیا جائے تو اس صورت میں اس کے ارادے یا قصد کے معنی مراد نہیں لئے جاسکتے۔

اور اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا عرش پر غلبہ بھی نہیں لیا جاسکتا اس لئے اس سے زیادہ وضاحت خود لفظ غالبؔ کر رہا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا

﴿واللہ غالب علی امرہ﴾

لہٰذا لفظ استوی کو عرش کے ساتھ ذکر کرنا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

اس سلسلے میں سب سے کامل اور مکمل بات وہی ہے جو حضرت امام اعظم نے اپنے رسالہ فقہ اکبر میں ارشاد فرمائی ہے:

ذکر اللہ تعالی فی القرآن من ذکر الوجہِ والیدِ والنَّفسِ فھولہ صفاتٌ بلاکیفٍ ، ولایُقَالُ ان یدَہ قدرتُہ او نعمتُہ لانّ فیہ ابطال الصفةِ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو اپنے چہرۂ مبارک اور ہاتھوں اور نفس مبارکہ کا ذکر کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات کی نشان دہی ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کا دست قدرت یا دست نعمت مراد نہیں لیا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ مفہوم مراد لینے سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔ اور ہمیں اپنی عقل کی نارسائی کا اقرار کرنا چاہئے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے کلام یا اسکی صفات میں نقص نکالیں۔

اور تمام اہل السنّت والجماعت، اور ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی ایسی کیفیت نہ مختص کریں جو مخلوقات میں سے کسی کے ساتھ مخصوص ہو:

(۱) امام اعظم کی رائے گرامی:

حضرت امام اعظم سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

من قال لااعرف اللہ ربی فی السماء ھو ام فی الارض ؟ فھو کافر ؛ لان ھذا القول یوھم ان للحق مکانا ومن یوھم ذلک فھو مشبّھة (الفقہ الابسط)

جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ جو میرا پروردگار ہے، آیا وہ آسمانوں میں ہے یا زمین

میں ہے؟ تو وہ کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کے اس قول سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ شائید وہ اللہ تعالی کے کسی مکان میں مقید ہونے کا قائل ہے، اور جو شخص اس قسم کے عقائد رکھتا ہو وہ فرقۂ مشبہہ میں سے ایک ہے

(۲) امام جعفر الصادق سے اس مسئلہ کے بارے منقول ہے:

قال التوحید ثلاثة احرف ، ان تعرف انه لیس من شیء ، ولا فی شیء ، ولا علی شیء ،لان من وصفه انه من شیء فقد وصف بانه مخلوق فیکفر، ومن قال انه فی شیء فقد وصفه بانه محدث فیکفر ، ومن قال علی شیء فقد وصفه بانه محتاج محمول فیکفر . (الجوہرۃ المنیفۃ:۱۱)

آپ نے فرمایا: توحید باری تعالی صرف تین حروف کو جاننے کا نام ہے اور وہ کہ اللہ تعالی نہ کسی چیز میں سے ہے، اور نہ کسی چیز کے اندر ہے، اور نہ اللہ تعالی کسی چیز کے اوپر ہے، اس لئے کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالی کسی چیز میں سے ہے تو گویا اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالی مخلوق ہیں اور ایسا عقیدہ رکھنا موجب کفر ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالی کسی چیز کے اندر ہے تو گویا وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالی محدث ہیں جس کی وجہ سے ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص کافر ہو جائے گا، اور جو شخص اللہ تعالی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالی کسی چیز کے اوپر ہیں تو اس نے اللہ تعالی کو محتاج سمجھا، اس لحاظ سے وہ بھی کافر ہو جائے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: حضرت امام جعفر امام اعظم امام ابوحنیفہ کے استاد بھائی ہیں، اس لئے کہ آپ نے اور امام ابوحنیفہ نے امام محمد الباقر سے اکٹھے علم حاصل کیا تھا، بعض میں یہ مشہور ہے کہ امام اعظم نے امام جعفر سے علم حاصل کیا تھا یہ بات مشہور ہے، مصدقہ نہیں ہے، اس لئے کہ امام ابوحنیفہ اور امام جعفر ہم عمر تھے استاد شاگرد نہیں تھے، البتہ ہم اُستاد تھے۔ امام محمد الباقر کے دونوں شاگرد تھے۔

(۳): امام مالک کی رائے

اس موضوع پر امام مالک بن انس کا قول، قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ جب امام مالک سے استوی علی العرش کے بارہ میں پوچھا گیا، تو آپؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

اَلاستوآءُ معلومٌ ، وَالکَیفُ مجھُولٌ؛وَالایمانُ به واجبٌ ؛وَالسُّؤالُ عنه بدعةٌ

استواء کا مفہوم تو معلوم ہے، لیکن اس کی کیفیت نامعلوم ہے، البتہ اس کے مطابق ایمان لانا واجب ہے، اور اس کی حقیقت کے بارے میں سوالات کرنا بدعت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالی کا عرش پر مستوی ہونا مفہوم کے لحاظ سے معلوم ہے، اور اس کی کیفیت نامعلوم ہے؛ اس پر ایمان لانا واجب ہے؛ کیونکہ ان پر ایمان لانا جزو ایمان ہے، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے؛ اور اس کے بارہ میں غور وغوض کرنا بدعت ہے؛ اور اس باب میں یہ کلام کافی اور وافی

ہے۔اس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو اور جانتا ہے کہ اس نے اللہ کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال اور ایمان کے مطابق بدلہ پانا ہے۔

(۴) امام محمد بن الحسن الشیبانی فرماتے ہیں:

انا نقول نؤمن بما جاء من عند اللّٰه تعالی علي ارادة اللّٰه تعالی ولا نشتغل بکیفیته وبما جاء من عند رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم علی ما اراد به رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم (الجوہرۃ المنیفۃ:۱۱)

ہم یوں کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوا ہے ہم ان سب باتوں پر ایمان لائے اور ان فرامین خداوندی سے اس کی جو مراد ہے، اس کی کیفیات کے جاننے میں ہم نہیں پڑتے، اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوا ہے اس پر بھی اسی طرح ہم ایمان لاتے ہیں اور ان کی کیفیات کے جاننے میں بھی ہم نہیں الجھتے۔

(۵) امام شافعی کی رائے گرامی:

اور امام محمد بن ادریس الشافعی کا اس بارے میں قول ہے:

آمنتُ بلاتشبیه ، وصدقت بلا تمثیل ، واتهمت نفسی فی الادراک ، وامسکت عن الخوض فیه کل الامساک

میں اللہ تعالی پر بلا کسی تشبیہ کے ایمان لاتا ہوں، اور بلا کسی مثالی صورت کے قائل ہونے کے اس کی تصدیق کرتا ہوں، اور اس کے ادراک میں نہ آنے کا الزام میں اپنے نفس کو دیتا ہوں، اور میں اس کے بارے میں غور وخوض کرنے سے مکمل اجتناب کرتا ہوں۔

(۶) امام احمد بن حنبل کی رائے گرامی:

اور امام احمد بن حنبل نے اس بارے میں فرمایا:

الاستواء کما اخبر ، لا کما یخطر بقلب البشر

استواء کا مفہوم وہ ہے جو ہمیں خبر صحیح سے معلوم ہوا ہے۔اس سے وہ مفہوم مراد نہ لیا جائے گا جو انسانی دلوں پر خیالات کی صورت میں وارد ہوتا ہے۔

(۷) امام فرغانی نے اسی کو ایک شعر کے انداز میں یوں کہا:

ورب العرش فوق العرش لکن بلا وصف التمکن واتصالی

اور عرش کا مالک عرش کے اوپر ہے، لیکن ہمارے مکان اور اتصال کے مفہوم سے بہت ورے ہے۔اللہ ہمیں حقیقی ایمان نصیب فرمائیں۔

دوسرا مسئلہ اللہ کا عرش کے ساتھ تعلق:

وَهُوَ حَافِظُ الْعَرْشِ وَغَيْرُ الْعَرْشِ مِنْ غَيْرِ احْتِيَاجٍ فَلَوْ كَانَ مُحْتَاجاً لَمَا قَدَرَ عَلٰى إِيجَادِ الْعَالَمِ وَتَدْبِيرِهِ كَالْمَخْلُوقِ ؛ وَلَوْ كَانَ مُحْتَاجاً إِلَى الْجُلُوسِ وَ الْقَرَارِ فَقَبْلَ خَلْقِ الْعَرْشِ أَيْنَ كَانَ اللّٰهُ تَعَالٰى ؟

ترجمہ: اللہ تعالیٰ وہ ذات ہیں جو عرش اور غیر عرش سب چیزوں کے محافظ ہیں اور یہ کہ وہ عرش کے محتاج بھی نہیں ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ بیٹھنے اور آرام کرنے کے لئے عرش کے محتاج ہوتے تو یہ سارا جہان بنانے پر وہ قدرت نہ رکھتے ؛ اور ان کے لئے اس سارے جہان کا تدبیر کرنا اور تمام مخلوقات کی طرح اس عالم کی دیکھ بھال کرنا ممکن نہ ہوتا۔

سوال: اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ اللہ تعالیٰ بیٹھنے یا آرام کرنے کے محتاج ہیں تو سوال پیدا ہوگا کہ عرش کی تخلیق سے قبل اللہ تعالیٰ کہاں آرام فرماتے تھے؟

جواب: اس کے بارے میں یہی عقیدہ رکھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ان تمام کیفیات اور اقوال سے پاک ہیں جن سے ذات باری تعالیٰ میں عاجزی اور نقص لازم آئے۔

تشریح: مسئلہ دوم: عرش کی حقیقت

عرش بھی اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے: جس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ایک اور مخلوق کرسی رکھی ہوئی ہے؛ اور عرش اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جو اللہ تعالیٰ نے پانی کے بعد بنائی ہے۔

حضرت وہب بن منبہؒ سے مروی ہے:

ان اللّٰہ تعالی خلق العرش من نورہ ، والکرسی بالعرش ملتصق، والماء کله فی جوف الکرسی ، والماء علی متن الریح وحول العرش اربعة انھار : نھر من لؤلو یتلألأ ، ونھر من نار یتلظی ، ونھر من ثلج ابیض تلمع منه الابصار ، ونھر من ماء ، والملائکة قیام فی تلک الانھار ، یسبحون اللّٰہ تعالی ، وللعرش اَلسنة بعدد اَلسنة الخلق کلھم ، فھو یسبح اللّٰہ ویذکرہ بتلک الالسنة کلھا، (ابن ابی حاتم فی تفسیرہ)

بے شک اللہ تعالیٰ نے عرش عظیم کو اپنے نور سے پیدا فرمایا، اور کرسی عرش کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور کرسی کے منہ میں پانی بھرا ہوا ہے، اور وہ پانی ہواؤں کے دوش پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عرش کے اردگرد چار نہریں ہیں ایک لؤلؤ کی نہر ہے جو بہت زیادہ چمکتی ہے، اور ایک بہت زیادہ بھڑکتی ہوئے آگ کی نہر

ہے، اور اس کے بعد ایک سفید چمکتی ہوئی برف کی نہر ہے جس کی چمک سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، اور ایک نہر پانی کی ہے، اور ملائکہ ان نہروں میں کھڑے ہوئے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عرش کی اتنی زبانیں ہیں جتنی اللہ تعالیٰ نے مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیحات ان سب زبانوں کے ساتھ کرتا رہتا ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے

وکان عرشہٗ علی المآء

یعنی اللہ کا عرش پانی پر تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے پانی کی تخلیق ہوئی اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا عرش معرضِ وجود میں لایا گیا۔ اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے

کتب اللہ مقادیر الخلائیق قبل ان یخلق السموٰات والارض بخمسین الف سنۃٍ وکان عرشہٗ علی المآء

[اخرجہ مسلم: ۴۷۹۷؛ الترمذی: ۲۰۸۲ احمد: ۶۲۹۱]

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں آسمان وزمین کے بنائے جانے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں؛ اور یہ وہ وقت ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا؛ اس سے یہ بات معلوم ہو جانی چاہئے کہ عرش بھی اللہ کی دیگر مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہے اور وہ بھی حادث (temporary) ہے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کی طرح دائمی (forever) اور قدیم (eternal) نہیں ہے۔

اسی طرح اللہ کی صفات میں سے ہے

(ہو رب العرش المجید)

یعنی اللہ تعالیٰ عرش عظیم کا بھی رب ہے اور عرش اس کا پروردہ اور پیدا کردہ ہے۔

اور اس عرش کے پائے بھی ہیں، جسے حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فاذا انا بموسیٰ آخذ بقائمۃ من قوائم العرش [اخرجہ البخاری: ۳۱۴۶]

یعنی میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عرش کے پائیوں میں سے ایک پایہ پکڑ کر کھڑا ہوں گا اور اللہ تعالیٰ کا عرش چار جہتوں میں محدود ہے۔ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے منقول ہے

ان السموات فی العرش کالقندیل المعلق بین السماء والارض

(ابن ابی حاتم فی تفسیرہ)

بے شک ساتوں آسمان اللہ تعالیٰ کے عرش کے ساتھ ایسے لٹک رہے ہیں جیسے کوئی قندیل آسمان وزمین کے درمیان لٹک رہی ہو۔ اسی طرح ارشادِ ربانی ہے

﴿حافین من حول العرش﴾

یعنی ملائکہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے گرد اس کو گھیرے ہوئے کھڑے ہیں؛ اور کئی پروں والے فرشتے اس کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ تمام آیات قرآنی بتاتی ہیں کہ عرش محدود (limited) اور مخلوق ہے۔ اس

کے کئی اجزاء ہیں، لہٰذا عرش باری تعالیٰ حادث اور عارضی ہے، دائمی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

کل شیءٍ ھالکٌ الاوجه

کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک علاوہ تمام اشیاء ہلاک ہونے والی ہیں اور عرش بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیاء میں سے ایک شئ ہے، لہٰذا وہ بھی فانی ہے۔

یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کے معانی کو دیکھتے ہوئے کسی قسم کے شک وشبہ میں مبتلاء نہ ہونا چاہئے کہ شاید عرش بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح دائمی ہے، بلکہ اس کا تعلق ذات باری تعالیٰ کے ساتھ اسی طرح ہے جس طرح اس کائنات اور اس کے مختلف اجرام وعناصر کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے؛

علامہ سیوطی نے ایک حدیث نقل فرمائی کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر کو مخاطب کر کے پوچھا؟

یا ابا ذر ما السموات السبع فی الکرسی الا کحلقة ملقاة فی ارض فلاة ،وفضل العرش علی الکرسی کفضل الفلاة علی تلک الحلقة(الھیئة السنیة)

اے ابوذر کیا تجھے معلوم ہے کہ یہ ساتوں آسمان اللہ تعالیٰ کی کرسی کے مقابلے میں کتنے بڑے ہیں ؟صرف اتنے بڑے ہیں جتنا ایک مندری کا دائرہ کسی بہت بڑے میدان میں پڑا ہوا ہو، اور اللہ تعالیٰ کا عرش اس کی کرسی سے اتنا بڑا ہے جتنا بڑا اس مندری سے وہ میدان ہے۔

تیسرا مسئلہ اللہ تعالیٰ صفات ناقصہ سے منزہ ہیں:

فَھُوَ مُنَزَّہٌ عَنْ ذٰلِکَ عُلُوّاً کَبِیْراً

ترجمہ: بس ہم یوں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت اور ضرورت نہیں کہ آرام کریں، یا کسی جگہ یا عرش پر آرام کی غرض سے بیٹھیں، بلکہ وہ اس قسم کی صفات، سے پاک اور منزہ ہیں۔

☆☆☆

پانچویں علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں چار مسائل فرمائے گئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ اول کلام اللہ مخلوق ہے یا نہیں؟

نُقِرُّ بِاَنَّ الْقُرآنَ کَلامُ اللّٰہِ تَعالٰی غَیرُ مَخلُوقٍ. وَوَحیُہٗ وَ تَنزِیلُہٗ علٰی رَسُوْلِ اللّٰہ ا ؛ وَصِفَتُہٗ لا ھُوَ وَلاغَیرُہٗ ؛ بَلْ ھُوَ صِفَتُہٗ عَلَی التَّحقِیقِ مَکْتُوبٌ فِی الْمَصَاحِفِ ؛ مَقرُوْءٌ بِالْاَلْسِنَۃِ ؛ مَحفُوظٌ فِی الصُّدُوْرِ غَیرُ حَالٍّ فِیھَا.

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ: قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اسی کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے لہذا یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے نہ کہ ذاتِ خدا، لیکن ذات سے غیر بھی نہیں ہے؛ بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باقی صفات کی طرح یہ بھی ایک صفت ہے جس کا ظہور قرآنِ کریم کے معرض وجود میں آنے کا باعث ہے۔

تشریح: مسئلہ کلام کا بیان

اس مسئلہ میں زمانہ قدیم اور موجودہ زمانے میں بھی بہت زیادہ کلام کیا گیا ہے کہ ’کلام باری تعالی ،ذات باری تعالی کا عین ہے، یا اس کا غیر ہے۔

اس مسئلے پر بڑے بڑے معرکے بھی ہوئے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہم ایک بار جمعہ کے دن کوفہ کی جامع مسجد میں تعلیمی حلقوں میں مصروف تھے کہ اتنے میں ایک شخص مسجد میں آیا، اور اس وقت مسجد میں جتنے بھی علمی حلقے لگے ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک میں گیا اور وہ ہر ایک حلقے میں جا کر صرف ایک ہی سوال کرتا تھا کہ ’’قرآن کریم کی کلام ہونے یا نہ ہونے کی کیا حقیقت ہے‘‘؟

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس وقت مکہ مکرمہ کے سفر پر گئے ہوئے تھے، اس لئے وہ ہمارے درمیان

موجود نہ تھے۔ امام اعظم جب واپس تشریف لائے تو ہم نے اس آدمی کے سوالات آپ کے سامنے رکھے اور عرض کیا کہ ایک شخص ہمارے پاس آیا تھا اور قرآن کریم کے اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کے بارے میں ہم سے چند سوالات کر گیا تھا ان کا کیا جواب ہونا چاہئے؟ امام اعظم نے جواب ارشاد فرمایا کہ میری وصیت یاد رکھو!

> ''اس قسم کے سوالات میں کبھی نہ پڑو، نہ ہی اس کے بارے میں بات چیت کیا کرو، اور نہ ہی اس کے بارے میں کسی سے سوال وجواب کیا کرو، اور اس عقیدے پر رک جاؤ کہ 'یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' اس عقیدے میں ایک حرف کی زیادتی نہ کرو، مجھے ڈر ہے کہ اہل اسلام اس مسئلے میں بہت زیادہ مبتلا ہو جائیں گے، اور اس کے بارے میں نہ کوئی حتمی فیصلہ کر پائیں گے، اور نہ کوئی حتمی رائے قائم ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو اس قسم کے مسائل کے بارے آراء سے شیطان لعین مردود کی طرف سے گمراہ نظریات کی آمیزش کرنے سے محفوظ فرمائے'' (الانتقاء:۱۶۶)

اس مسئلے کی مزید تفصیل علامہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے الانتقاء میں مکمل انداز میں بیان فرمائی ہے جس کو ہماری تصنیف ''امام اعظم کی وصیتیں اور نصیحتیں'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی مسئلے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے امام نسفی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

> فنقول الله تعالى بجميع صفاته واسمائه قديم ازلى وصفات الله تعالى واسمائه لاهو ولا غيره ، لانا لو قلنا بان هذه الصفات هوالله ، يؤدى الى ان يكون الهين اثنين ،والله تعالى واحد لاشريك له ؛ ولو قلنا بان هذه الصفات غير الله تعالى لكانت هذه الصفات محدثة وهذه لايجوز ......
>
> والحاصل ان المكتوب فى المصاحف : الالفاظ الدالة على المعنى القائم بالذات والمعنى القائم بذاته تعالى غير حال فى المصاحف (الجوهرة المنيفة:۱۲)

بس ہم صرف اتنا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء اور اس کی تمام صفات، قدیم اور ازلی ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات نہ تو اس کی ذات کا عین ہیں اور نہ ہی اس کی ذات کے سوا مستقل وجود رکھتی ہیں، کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ صفات باری اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہیں اور وہ بھی خدا پاک کا ایک جزو ہیں تو ہماری اس رائے سے دو خدا ہونا لازم آئے گا ایک ذات باری تعالیٰ اور دوسرا اس کی صفات جو اس سے ہٹ کر اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔ جو کہ جائز نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہیں۔

اور اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات کا غیر ہیں یعنی ذات باری تعالیٰ صفات باری تعالیٰ سے الگ اور مستقل وجود رکھتی ہیں تو اس سے معلوم ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کو حادث مان رہے

ہیں، کیونکہ ان کو بعد میں تخلیق کر کے ذات باری کے ساتھ جوڑا گیا ہوگا جو اس کے حادث ہونے کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ بات بھی درست نہیں ہے۔

خلاصہ کلام:

اس ساری بحث کا یہ نکلے گا کہ مصاحف میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس میں الفاظ جو معنی پر دلالت کرتے ہیں وہ بذاتہٖ قائم ہیں اور جو اس کلام کے معنی ہیں وہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم جبکہ ذات باری تعالیٰ ان مصاحف میں سرایت نہیں کیے ہوئے۔

بس ہم صرف اتنا عقیدہ رکھ سکتے ہیں کہ: کلام، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ذات باری بھی نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے سواء کچھ اور ہے۔

ایک مثال:

اس کو سورج کی مثال سے سمجھ لینا چاہئے کہ دھوپ سورج ہے یا سورج نہیں ہے؟ اس کو ہم سورج بھی قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ دھوپ کو سورج قرار دینے سے جہاں جہاں دھوپ ہوگی، وہاں وہاں سورج کا وجود سمجھا جائے گا تو ایسی صورت میں آسمان پر منبع دھوپ کا کیا نام رکھا جائے گا جو زمین سے کروڑوں میل دور ہے، اور مستقل تشخص رکھتا ہے اور اس کے طلوع ہونے کے ساتھ دھوپ ہوتی ہے اور اس کے غروب ہو جانے کے بعد دھوپ غائب ہو جاتی ہے اور بادل جس کو چھپا دیتے ہیں، اور اگر اس کو سورج کے سوا ایک اور مستقل ایک چیز مان لیں تو بھی مشکل ہے اس لئے کہ جب سورج نہ ہو تو دھوپ نہیں ہوتی اور جب بادل ہو جائے تو دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔ بس جس طرح سورج اور دھوپ میں تلازم صفاتی ہے، تلازم ذاتی نہیں ہے۔ اسی طرح ذات باری تعالیٰ میں تلازم صفاتی ہوگا اور تلازم ذاتی نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مسئلہ دوم قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہونے کی حقیقت:

وَ كَلَامُهٗ تَعَالٰی مَقْرُوْئًا وَ مَكْتُوْبٌ وَمَحْفُوْظٌ مِنْ غَيْرِ مُزَايَلَةٍ عَنْهُ

ترجمہ: قرآنِ کریم ایک کتاب ہے جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے؛ زبان کے ساتھ پڑھا جانے والا؛ سینوں میں محفوظ ہو جانے والا؛ اور اس میں کچھ بھی زائل نہیں ہوتا۔

مسئلہ سوم تخلیقات انسانی کی حقیقت:

وَ الْحُرُوْفُ وَ الْحَرَكَاتُ ؛ وَ الْحِبْرُ وَالْكَاغَذُ ؛ وَ الْكِتَابَةُ وَ الْقِرَائَةُ كُلُّهَا مَخْلُوْقَةٌ لِاَنَّهَا أَفْعَالُ الْعِبَادِ . وَ كَلَامُ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی غَيْرُ مَخْلُوْقٍ لِاَنَّ الْكِتَابَةَ وَالْحُرُوْفَ وَ الْكَلِمَاتِ وَالْاٰيَاتِ كُلَّهَا دَلَالَاتٌ

الْقُرْآنِ لِحَاجَةِ الْعِبَادِ اِلَيهَا ،

ترجمہ: اور تمام حروف ،حرکات ، سیاہی ، کاغذ ،اور کتابت اور اشیاء کی طرح اللہ تعالی کی مخلوقات میں سے مخلوق ہیں؛ کیونکہ یہ اشیاء اپنے وجود میں آنے کے لئے بندوں کے فعل کی محتاج ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق نہیں کیونکہ وہ اپنے وجود میں آنے کے لئے کتاب، حروف، کلمات اور عبارات کا محتاج نہیں ۔ یہ تمام آلات قرآنی ہیں اور ان آلات کی تشکیل بندوں کی ضرورت کے پیش نظر کی گئی ہے، نہ کہ اللہ تعالی کی ضرورت کی وجہ سے،اور ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ آلات قرآنی نہ ہوں تو بندے اللہ تعالی کی اصل مراد تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

مسئلہ چہارم کلام اللہ کی حقیقت اور اس کا مفہوم

وَكَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى قَائِمٌ بِذَاتِه وَ مَعْنَاهُ مَفْهُوْمٌ بِهٰذِهِ الْاَشْيَآءِ فَمَنْ قَالَ بِاَنَّ كَلَامَ اللّٰهِ تَعَالٰى مَخْلُوْقٌ فَهُوَ كَافِرٌ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ، وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى مَعْبُوْدٌ لَايَزَالُ كَمَا كَانَ

ترجمہ: اور اللہ تعالی کا کلام بذات خود قائم ہے؛ اور اپنے قائم ہونے میں اس کے علاوہ کسی کا محتاج نہیں ؛ اور اس کا مطلب اور مفہوم انھی آلات ،کلماتِ، حروف اور حرکات سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالی کا کلام مخلوق ہے وہ اصل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کر رہا ہے؛ اور اللہ تعالی معبود ہے اور اپنی ہر صفت میں جس طرح ہے، ہمیشہ سے اسی طرح ہے؛ اللہ تعالی کو ان صفات کے بدلنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور اس کا کلام پڑھا، لکھا، اور محفوظ کیا جاتا ہے اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تعلیم کے عمل میں اس لئے زائل ہو جائے کہ اس کے لئے مناسب الفاظ ،صحیح ادائیگی ،اور درست تحریر، پورے کلمات ،کامل حروف نہ مل سکتے ہوں۔

چھٹی علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں دو مسائل بیان فرمائے گئے ہیں

مسئلہ اوّل امت میں افضل ترین شخص؟

نُقِرُّ بِاَنَّ اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ ا اَبُوْبَکْرِنِ الصِّدِّیْقِ ص ؛
ثُمَّ عُمَرص ثُمَّ عُثْمَانَ ص ثُمَّ عَلِیّ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَیْهِمْ اَجْمَعِیْنَ ؛
لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی :

﴿ والسَّابقُون السَّابقُون اولٰئک المقرَّبُون فی جَنّٰتِ النَّعِیمِ﴾

(الواقعۃ: ۱۰-۱۲)

وکُلُّ مَن کان اَسبَق فھُوافضل

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُمت میں افضل ترین شخص حضرت سیدنا ابوبکرؓ الصدیق اس کے بعد حضرت عمرؓ الفاروق اس کے بعد حضرت عثمانؓ ذوالنورین اس کے حضرت علیؓ المرتضی ہیں؛ اور دلیل اس کی اللہ تعالی کا فرمان ہے:

''اور سبقت لے جانے والے اللہ تعالی کے مقرب بندوں میں سب سے آگے ہیں اور نعمتوں والی جنت میں ان کا ٹھکانہ ہوگا''

اللہ تعالی کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان لانے میں جو زیادہ مقدم ہے وہی زیادہ افضل اور دوسرے صحابہ پر مقام کے لحاظ سے مقدم ہے۔

تشریح: مسئلہ اول: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے مردوں میں سے سب سے افضل کون ہے؟ اس کے بارے میں امت میں پانچ رائے مروّج ہیں:

(۱) پہلی رائے یہ ہے کہ افضلیت کی ترتیب یوں ہے کہ حضور اکرم کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں اور یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے بعد سب سے افضل حضرت ابوبکر پھر حضرت عمر اس کے بعد حضرت علی اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ہیں، یہ رائے زیدیہ وغیرہم کی ہے۔

(۳) تیسری رائے یہ کہ حضور علیہ السلام کے بعد امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر، اس کے بعد حضرت عمر، اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ہیں، اور اس کے بعد خاموشی ہے۔ اس رائے کو امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے 'ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء' میں نقل کیا ہے۔ اس رائے پر وجہ استدلال یوں ہے کہ ایک بار حضرت علی کوفہ کی جامع مسجد میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ آپ کے صاحب زادے حضرت محمد بن حنفیہ نے آپ سے سوال کیا:

من خیر هذه الامة بعد رسول الله صلی الله علیه وسلم؟

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں سب سے افضل کون شخص ہے؟ آپ نے جواب دیا حضرت ابوبکر۔ آپ نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ آپ نے فرمایا حضرت عمرؓ۔ آپ نے پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ آپ نے فرمایا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ آپ نے پوچھا کے اس کے بعد افضل ترین کون شخص ہے؟ تو آپ جواب میں خاموش رہے۔ اور فرمایا اگر میں چاہتا تو اس چوتھے شخص کے بارے میں بھی بتا سکتا تھا۔ یہ بات سن کر محمد بن حنفیہؒ نے کہا: کیا وہ آپ تو نہیں ہیں؟ تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ تمہارا والد تو عام مسلمانوں میں سے ایک ہے اور اپنی تعریف میں ایک جملہ بھی ارشاد نہیں فرمایا (الجوہر المنیفۃ: ۱۴)

(۴) چوتھی رائے یہ ہے کہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل حضرت علی ہیں اور اس کے بعد حضرت ابوبکر اور پھر باقی صحابہ کرام ہیں۔ یہ رائے اہل التشیع میں سے فرقہ تفضیلہ کی ہے۔ ان افراد میں جنھوں نے ابوبکر و عمر کو افضل جانا ہے، ان کے ہاں ان دونوں میں سے ابوبکر افضل ہیں اور اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام آتا ہے۔ اسی طرح جنھوں نے حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کو افضل مانا ہے ان کے نزدیک حضرت عمر زیادہ افضل ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے۔

(۵) پانچویں رائے یہ کہ اس بارے میں ہم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کون کس سے افضل ہے اس قول میں الجھی ہوئی ذہنیت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور یہ الجبائی کا قول ہے۔

مسئلہ دوم صحابہ کرام سے محبت یا ان سے بغض کرنا:

وَيُحِبُّهُمْ كُلُّ مُؤْمِنٍ تَقِيٍّ ؛ وَيُبْغِضُهُمْ كُلُّ مُنَافِقٍ شَقِيٍّ

ترجمہ: اور ہر مؤمن، متقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کرتا ہے؛ جبکہ ہر منافق

، بدقسمت ان سے بغض رکھتا ہے۔

تشریح: مسئلہ دوم: صحابہ کرام میں ہر ایک کے ساتھ محبت رکھنا اور کسی کے بارے میں بھی کوئی برائی دل میں نہ رکھنا یہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مؤقف ہے

کیونکہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ان کے بارے میں فرمایا ہے:

اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوی لھم مغفرۃ واجر عظیم

یہی لوگ ہیں جنکے دلوں کو تقوی کے امتحان میں آزمایا گیا تو ان کے لئے مغفرت اور بہت بڑے اجر کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اتنی وضاحت اور صراحت کے بعد ہمیں زیبا نہیں ہے کہ ہم اپنی زبانوں کو ان عظیم ہستوں کے طعن میں کھولیں، بلکہ ہمارے دلوں میں ان کا سراسر احترام اور محبت ہی ہونی چاہئے۔ رہا مسئلہ ان مشاجرات کا جو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئے ہیں، ان سب کے بارے ہم حسن ظن رکھتے ہیں کیونکہ وہ تمام واقعات یقیناً نیک نیتی اور اخلاص وللّٰہیت کی بنا پر تھے اور ان میں سے ہم ہرگز ہرگز کسی کی نیت فاسد کا اعتقاد نہیں رکھتے۔

اس لئے کہ اللہ تعالی کے قرآن مقدس کی گواہی طبری اور ابن اثیر اور ابن کثیر سے بہر حال مقدم ہے اور ہم اسی طرح جانتے ہیں اور تمام اہل السنّت والجماعت کے افراد کو ان واقعات کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالی نے اگر ہماری تلواریں ان کے خون سے محفوظ کر دی ہیں تو ہم بھی اپنی زبانوں کو ان کی عزت وناموس سے آلودہ کرنے سے محفوظ رکھیں۔

اگر چہ آج بہت سے جدت پسند تاریخ میں انصاف مہیا کرنے کی غرض سے بڑی کوششیں کرتے ہیں کہ ہم یہ طے کریں کون حق پر تھا اور کون ناحق پر تھا؟ لیکن ان کے فیصلے سے مقدم ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا

الصحابہ کلھم عدول

یعنی صحابہ سارے کے سارے راہ عدل وصفا کے راہی تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالی ہمیں جدید تحقیقات کے روپ میں جدید تلبیسات کی شکل میں تلبیسات ایمانی سے محفوظ فرمائے۔ آمین یارب العالمین

☆☆☆

ساتویں علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں سات مسائل بیان فرمائے گئے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ اوّل انسان اپنے تمام اوصاف سمیت مخلوق ہے:

نُقِرُّ بِاَنَّ الْعَبْدَ مَعَ جَمِيْعِ اَعْمَالِهٖ وَاِقْرَارِهٖ وَمَعْرِفَتِهٖ مَخْلُوْقٌ ؛ فَلَمَّا كَانَ الْفَاعِلُ مَخْلُوْقًا فَاَفْعَالُهٗ اَوْلٰى اَنْ تَكُوْنَ مَخْلُوْقَةٌ ؛ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ طَاقَةٌ لِاَنَّهُمْ ضُعَفَاءُ عَاجِزُوْنَ .

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ بندہ اپنے تمام اعمال ، ایمان کے اقرار، اور معرفتِ الٰہیہ سمیت اللہ تعالی کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے کیونکہ جب اعمال کا عامل خود انسان ہی مخلوق ہے تو اس سے صادر ہونے والے اعمال بطریق اولیٰ اللہ تعالی کی مخلوق ہوں گے، اور بندوں کے پاس اپنی ذاتی کوئی طاقت نہیں ہے، بلکہ وہ سب بندے اللہ تعالی کی طاقت کے سامنے بے طاقت ، ہیں کیونکہ وہ کمزور، اور اللہ تعالی کے عاجز بندے ہیں۔

تشریح: انسانوں کے اعمال کی حقیقت کے بارے میں امت میں اختلاف ہے

پہلی رائے یہ ہے کہ انسان کے اختیار و قدرت میں کچھ بھی نہیں ، بلکہ سب کچھ اللہ تعالی کی قدرت واختیار میں ہے۔ وہ جو حکم دیتا ہے، وہ ہو جاتا ہے اور جس بات سے منع کرتا ہے، وہ چیز نہیں ہوسکتی اور ہر کام اللہ تعالی کی ازلی اور ابدی قدرت واختیار کے تابع ہے۔ انسان اس بارے میں مجبور محض ہے اور اس کو کسی کام کے کرنے کا کوئی اختیار اور قدرت نہیں ہے۔ اس نظریہ کے حامل افراد کا نام جبریہ ہے۔

دوسری رائے: یہ ہے کہ انسان تمام تر قدرتوں اور اختیارات کا مالک ہے جو چاہے وہ کرسکتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ ہوسکتا ہے، ہر عمل کا عامل انسان بذات خود ہے اور انسان کے اپنی قدرت وارادہ اور اختیار کی وجہ سے اس کے تمام اعمال معرض وجود میں آتے ہیں، اللہ تعالی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

تیسری رائے: یہ ہے کہ اعمال کا اصل خالق تو اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات ہے۔ اس لئے کہ ہر چیز کا خالق حقیقی تو وہی ہے اور اعمال بھی اشیاء میں سے ہیں لہٰذا ان اعمال کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ البتہ انسان کو ان اعمال کا کسب حاصل ہوتا ہے یا انسان اپنے قوت ارادے کا مالک ہے۔ اسی وجہ سے بندہ خیر یا شر کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اہل السنّت والجماعت کی رائے ہے۔

مسئلہ دوم اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے خالق و رازق ہیں:

وَنُقِرُّ بِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالَى خَالِقُ الْخَلْقِ والعباد وَرَازِقُهُمْ ومميتهم ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالَى:

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (الروم:۴۰)

ترجمہ: اور ہم اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے خالق اور ان کے رازق ہیں اور ان کو موت دینے والے ہیں؛ اور دلیل اس بات کی اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

''اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں زندہ رہنے کے لئے رزق دیا، پھر اسی نے تمہیں زندگی دی، اور وہی تمہیں موت بھی دے گا''۔

مسئلہ سوم حلال اور حرام کمائی اور اس کا حکم

وَ الْكَسْبُ بِالْعَمَلِ حَلَالٌ وَجَمْعُ الْمَالِ حَلَالٌ ؛ وَجَمْعُ الْمَالِ مِنَ الْحَرَامِ حَرَامٌ.

ترجمہ: اور حلال ذرائع کمائی گئی دولت حلال ہے؛ اور اس مال کو جمع کرنا بھی حلال ہے، اور حرام ذرائع سے مال جمع کرنا حرام ہے، اور اسی طرح کا مال جمع کرنا بھی حرام ہے۔

تشریح: البتہ اگر حرام مال کھالیا جائے یا استعمال کرلیا جائے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) اس کا استعمال بوجہ اضطرار یا مجبوری کے ہو تو جس حد تک مجبوری ہے اس حد تک تو گناہ نہ ہوگا ؛ اور مجبوری ختم ہو جانے پر بھی اس کا استعمال میں لانا گناہ ہے، البتہ اس کے استعمال سے صادر شدہ فعل شرعی ذمہ داری پوری کرنے کے لئے کافی ہوگا؛ مثلاً حرام روزی کھانے کے بعد اگر کوئی شخص نماز ادا کرے تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی؛ لیکن حرام مال جمع کیا جائے اور اس کا مالک بھی معلوم ہو تو اس کا لوٹانا لازم ہے؛ اسی طرح اگر چور کے پاس چوری شدہ مال مل گیا تو اس کے اصل مالک کو لوٹا دیا جائے گا؛ بشرطیکہ اس

چور پر حد جاری نہ کر دی گئی ہو۔

(۲) اور اگر اس حرام مال کو شوقیہ استعمال کیا گیا ہے تو دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ کہ اس کو ناجائز سمجھ کر استعمال کیا گیا ہو تو یہ گناہ کبیرہ ہے جس کے لئے توبہ استغفار کثرت سے کرنے کی ضرورت ہے، لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ استعمال کرنے والے نے اس کو اگر حلال سمجھ کر استعمال کیا ہو جب کہ اس مال کی حرمت نص سے معلوم ہوتی ہو ایسا عمل موجب کفر ہے۔ اس صورت میں تجدید ایمان ضروری ہے اور اس مسئلے میں ایک اختلاف بھی ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ

اگر کوئی شخص حرام مال کے بدلے میں کوئی بیع وشراء کرتا ہے تو کیا اس کی یہ بیع یا شراء منعقد ہو جائے گی یا نہیں ہوگی؟

اہل السنۃ میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی یہ بیع وشرا منعقد نہ ہوگی۔ اس طرح اگر کسی سے چھین کر کپڑے پہن لئے اور ان کے ساتھ نماز ادا کی تو ان کے نزدیک اس کی نماز نہ ہوگی اور اگر کسی کی چھینی ہوئی جگہ پر نماز ادا کی تو نماز نہ ہوگی

دوسری رائے یہ ہے کہ گناہ کا اثر متعدی نہیں ہوتا، بلکہ گناہ کا اثر گناہ کی حد تک رہتا ہے۔ اس لئے اگر چھینے ہوئے مال کے ساتھ یا چھینی ہوئی زمین پر نماز ادا کی تو اس سے وہ عبادت تو ہو جائے گی، لیکن اجر میں کمی ہوگی اور یہی رائے صحیح ہے۔

مسئلہ چہارم ایمان کے لحاظ سے انسانوں کی اقسام:

ثُمَّ النَّاسُ عَلٰی ثَلَاثَةِ أَصْنَافٍ :

۱۔ اَلْمُؤْمِنُ الْمُخْلِصُ فِیْ اِیْمَانِهٖ .

۲۔ وَ الْكَافِرُ الْمُجَاهِدُ فِیْ كُفْرِهٖ .

۳۔ وَ الْمُنَافِقُ الْمُدَاهِنُ فِیْ نِفَاقِهٖ .

ترجمہ: انسان اپنے ایمان کے لحاظ سے تین اقسام پر مشتمل ہے

(۱): مؤمن جو اپنے ایمان میں مخلص ہو اور دل سے اللہ تعالیٰ کے دین کا مطیع اور فرمانبردار بھی ہو؛

(۲): اور وہ کافر جو کفر پر قائم ہونے کے ساتھ اس کے پھیلاؤ میں جدوجہد کرنے والا بھی ہو؛

(۳): اور ایسا منافق جو اپنے نفاق کا علانیہ اقرار کرنے والا ہو اور اس

میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرتا ہو۔

تشریح: انسانوں کی اپنے ایمان وتصدیق کے لحاظ سے تین اقسام ہیں جس کی تفصیل امام اعظم نے العالم والمتعلم میں ،اور علامہ ابن عبدالبر اندلسی نے الانتقاء میں یوں بیان فرمائی ہے:

واقسام الناس ثلاثة بايمانهم وتصديقهم : فمنهم من صدّق الله وماجاء منه بقلبه ولسانه ، ومنهم من صدّقه بلسانه وهو يكذبه بقلبه ، ومن هم من يصدّقهم بقلبه ويكذّب بلسانه

(۱):فأما من صدّق الله عزّوجل وما جاء به رسوله عليه السلام بقلبه ولسانه فهم عند الله وعند النّاس مؤمنون.

(۲):ومن صدّق بلسانه وكذّب بقلبه كان عند الله كافرا وعند الناس مؤمنا ، لان النّاس لايعلمون ما فى قلبه وعليهم ان يسمّوا مؤمنا بما اظهر لهم من الاقرار بهذا الشهادة ، وليس لهم ان يتكلفوا على علم القلوب.

(۳):ومن هم من يكون عند الله مؤمنا وعند النّاس كافراً وذلک ان يكون المؤمن يظهر الكفر بلسانه فى حال التقيته ، فيسميهم من لا يعرف كافرا ، وهو عند الله مؤمنا (العالم والمتعلم ، والانتقاء : ۱۶)

ایمان وتصدیق کے لحاظ سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں بعض تو وہ ہیں جواللہ تعالی کی اور جو کچھ اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی اپنے دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرتے ہیں اوران میں بعض لوگ وہ ہیں جواپنی زبان سے مذکورہ باتوں کی تصدیق کرتے ہیں لیکن اپنے دل سے اس کو جھٹلاتے ہیں ،اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے دل سے ایمان والی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن زبان سے اس کو جھٹلاتے ہیں۔

اس لئے (۱) جو شخص اللہ تعالی کی تصدیق کرتا ہے اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کی طرف سے باتیں لائے ہیں ان کی اپنے دل سے تصدیق کرتا ہے اور اپنی زبان سے اس کی تکذیب کرتا ہے تو وہ شخص اللہ تعالی کے نزدیک بھی اور لوگوں کے نزدیک بھی مؤمن سمجھا جائے گا۔

(۲) جو شخص اپنی زبان سے تو مذکورہ باتوں کی تصدیق کرتا ہو،لیکن دل سے ان کو جھٹلاتا ہو وہ اللہ تعالی کے نزدیک تو کافر سمجھا جائے گا،لیکن اس کے بارے میں فتوی اس کے ایمان دار ہونے کا دیا جائے گا۔اس لئے کہ لوگ کسی کے دل کی بات کو نہیں جان سکتے لہذا ان کو چاہیئے کہ وہ ان کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے ان کو مؤمن کہیں کیونکہ اس شخص کے اقرار کی وجہ سے ان کو یہی گواہی ملتی ہے،اور انسانوں میں سے کوئی اس بات کا مکلف نہیں بنایا گیا کہ لوگوں کے دلوں کو ٹٹولتا پھرے کہ معلوم ہو اس کے دل میں کیا بات چھپی ہوئی ہے۔

(۳) جو شخص اللہ تعالی کے نزدیک مؤمن اور لوگوں کی نظروں میں کافر سمجھا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے اپنی زبان سے کفر کا اظہار کیا ہے، اگر چہ اس کا یہ عمل تقیہ کی بناء پر ہی تھا، لہٰذا جس چیز کے بارے میں ہم جان نہیں سکتے اس کو کافر ہی کہا جائے گا اگر چہ وہ اللہ تعالی کے نزدیک مؤمن شمار کیا جائے گا اس لئے کہ اللہ تعالی عالم الغیب ہے

مسئلہ پنجم اللہ تعالی کی طرف سے فرض:

وَ اللّٰهُ تَعَالٰی فَرَضَ عَلَی الْمُؤْمِنِ الْعَمَلَ وَعَلَی الْکَافِرِ الْاِیْمَانَ وَعَلَی الْمُنَافِقِ الْاِخْلَاصَ ؛ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰی :

یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ (لقمان:۳۳)

مَعْنَاهُ : یٰاَیُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ اَطِیْعُوااللّٰهَ ، وَاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ آمِنُوْا بِاللّٰهِ؛ وَاَیُّهَا الْمُنَافِقُوْنَ اَخْلِصُوْا لِلّٰهِ .

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں پر ایمان لا چکنے کے بعد عمل لازم کیا ہے اور کافروں پر پہلے نمبر پر ہی ایمان لانا لازم کیا ہے؛ اور منافقوں پر اخلاص لازم کیا ہے اور دلیل اس بات کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو''

تو مطلب اس کا یوں ہوگا کہ اے لوگو اگر تم مؤمن بن چکے ہو تو اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اطاعت اور فرمانبرداری میں لگ جاؤ؛ اور اگر پہلے تم عالمِ کفر میں مبتلا ہو تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ؛ اور اگر تم منافقت کی بے آب و گیاہ وادی میں سرگرداں و پریشاں ہو تو اپنے من کو اخلاص کے زیور سے مزین کرو۔ کیونکہ اسی پر تمہاری دائمی کامیابی کا مکمل انحصار ہے؛

☆☆☆

آٹھویں علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں دو مسائل بیان فرمائے گئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ اوّل انسان کے عمل کرنے کی طاقت عمل سے پہلے ہے یا بعد میں؟

نُقِرُّ بِأَنَّ الْاِسْتِطَاعَةَ مَعَ الْفِعْلِ لَاقَبْلَ الْفِعْلِ وَلَابَعْدَ الْفِعْلِ لِاَنَّهُ لَوْ كَانَ قَبْلَ الْفِعْلِ لَكَانَ الْعَبْدُ مُسْتَغْنِياً عَنِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى وَقْتَ الْفِعْلِ وَهٰذَا خِلَافُ حُكْمِ النَّصِّ ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى:

﴿وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ﴾ (محمد:۳۷)

وَلَوْ كَانَ بَعْدَ الْفِعْلِ لَكَانَ مِنَ الْمَحَالِ ، لِاَنَّهُ حُصُوْلُ الْفِعْلِ بِلَا اِسْتِطَاعَةٍ وَ طَاقَةٍ .

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ تمام اعمال کے بجالانے کی طاقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس عمل کی بجا آوری کے ساتھ ہی ملتی ہے، نہ یہ طاقت اس عمل کے صادر ہونے سے پہلے ملتی ہے، اور نہ ہی یہ طاقت اس عمل کے صادر ہو جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے؛ کیونکہ اگر عمل کرنے کی یہ استطاعت پہلے سے بندے کو حاصل ہو تو وہ بندہ اپنے اعمال کی سرانجام دہی میں اللہ تعالیٰ سے مستغنی ہو کر کار خود مختار بن جائے گا اور اس قسم کا عقیدہ رکھنا احکامات شریعہ کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”اور اللہ تعالیٰ غنی ہے جبکہ (اے اللہ کے بندو) تم سب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے فقیر اور محتاج ہو“

اور اگر یہ کہا جائے کہ بندے کو اس عمل کے بجالانے کی طاقت اس عمل کے سرانجام

دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے، تو یہ بات ناممکن ہے (impossible) ہے، کیونکہ اس طرح ہم ایک ناممکن بات کو ممکن کہہ رہے ہیں؛ اس لئے کہ کسی کام کا سرانجام دیا جانا یا عمل میں لانا اس وقت ممکن ہوسکتا ہے جب تمہارے پاس اس کام کے کرنے کی طاقت و استطاعت موجود ہو۔

تشریح: انسان کو اعمال کی انجام دہی کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طاقت ملتی ہے، اس کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ وہ استطاعت کب حاصل ہوتی ہے۔

پہلی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف۔ سے اعمال کی بجا آوری کی استطاعت اعمال کے صادر ہونے سے پہلے حاصل ہوتی ہے۔ اس رائے میں اس لحاظ سے درستگی نہیں ہے کہ فعل کا صدور ابھی ہوا نہیں اور اس کی استطاعت پہلے ہی مل جائے۔ اس سے تو یہ لازم آتا ہے نیکی یا بدی کی استطاعت کی صورت میں اس کو مجرم قرار نہیں دیا جانا چاہئے کیونکہ اس سے فعل کا صدور ایسی صورت میں ہوا ہے جب کہ اس کو پہلے ہی طاقت دی جاچکی ہے یہ بات عقلاً اور نقلاً ناممکن ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ فعل کی استطاعت اس فعل کے صادر ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فعل کے صادر ہونے سے پہلے اس کی استطاعت تو بندے کو بالکل حاصل نہیں ہوتی، البتہ جب صدور فعل ہوجاتا ہے تو اس کے بعد بندے کو استطاعت ملتی ہے۔ یہ رائے بھی عقل اور نقل کے لحاظ سے ناقابل سمجھ اور ناقابل فہم ہے۔ فعل تو پہلے ہوچکا ہے، لیکن استطاعت بعد میں ملے اس سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ افعال کے صدور سے پہلے استطاعت کی اور طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی، البتہ بغیر استطاعت کے بھی افعال کا صدور ممکن ہے جو ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ نے بندے کو جس طاقت کی بنا پر مکلف بنایا ہے۔ اس کے بغیر ہی اس سے افعال صادر ہونا ممکن ہوجائیں۔

تیسری رائے یہ ہے کہ فعل کے صادر ہونے کی استطاعت اس فعل کے ساتھ ہے، نہ اس سے پہلے ہے اور نہ اس کے بعد ہے۔ یہ رائے جمہور اہل السنّت والجماعت کی ہے۔ اس کے بارے میں جو صحیح ترین رائے ہے وہ متن میں بھی مذکور ہے اور وہی درست ترین رائے ہے کہ اعمال وافعال کے صادر ہونے کے ساتھ ہی ان کو اس فعل کی طاقت ملتی ہے، نہ اس فعل کے صادر ہونے سے پہلے وہ طاقت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی صدور فعل کے بعد ان کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر اہل نظر کے ہاں ہر دم اللہ تعالیٰ سے خیر مانگنی چاہئے اور اسی سے اس کا فضل مانگنا چاہے اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو سارے جہاں سے غنی ہے اور فضل اور کرم کرنے والا ہے۔ اسی لئے قطعہ ہے کہ

تو غنی ہے کل جہاں سے میں فقیر
آ گیا در پر ترے بندہ حقیر

گر تو نے میری بخشش کا نہ فیصلہ کیا
تو رہے گا خوف مجھ کو دار و گیر

علامہ اقبال نے یوں کہا ہے:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذرہائے من پذیر
گر توے بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

مسئلہ دوم مخلوق کے اعمال استطاعت الٰہی کے ساتھ ہیں:

وَاللّٰهُ خَالِقُ الْخَلْقِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ طَاقَةٌ وَ لِاَنَّهُمْ ضُعَفَآءُ عَاجِزُوْنَ، وَلَا طَاقَةَ لِلْمَخْلُوْقِ فِيْ مَا لَمْ تُقَارِنْهُ الْاِسْتِطَاعَةِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے خالق ہیں جبکہ ان مخلوقات میں سے کسی کے پاس بذاتِ خود کوئی طاقت نہیں اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے عاجز اور کمزور مخلوق میں سے ہیں، اور یہ طاقت بندوں کو اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام کو ساتھ ساتھ بجالانے کی توفیق اور استطاعت حاصل نہ ہو جائے۔

تشریح: ہر قسم کی طاقت اور قدرت کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے مقابلے میں کوئی طاقت اور کوئی قدرت ایسی نہیں ہے جو دنیا میں کوئی عمل بھی سرانجام دے سکے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ط وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ

اور تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور تم قرآن میں سے کچھ پڑھتے ہو اور کوئی عمل بھی کرتے ہو، مگر ان کاموں میں مشغولیت کے وقت تم ہماری نگہبانی میں ہوتے ہو، اور زمین و آسمان میں سے کوئی چیز ایک ذرے کے برابر بھی غائب نہیں ہے، اور نہ کوئی چھوٹی چیز اور نہ کوئی بڑی چیز، مگر اس روشن کتاب میں موجود ہونے کی بناء پر معرض وجود میں آتی ہے۔ (یونس:۶۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت واختیار ہر ایک پر غالب وحاکم اور اس کے علم کے بغیر کچھ بھی صادر وظاہر نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک پر اللہ تعالیٰ کا غلبہ اور ہر ایک پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور ساری کائنات اس کے سامنے مجبور ومقہور ہے۔

نویں علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں دو مسائل بیان فرمائے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں

مسئلہ اوّل موزوں پر مسح کرنا:

نُقِرُّ بِأَنَّ الْمَسحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ جَائِزٌ لِلْمُقِيمِ يَوماً وَ لَيْلَةً وَ لِلْمُسَافِرِ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ وَّ لَيَالِيهَا لِاَنَّ الْحَدِيثَ وَرَدَ هٰكَذَا ؛ وَ مَنْ اَنْكَرَهُ فَاِنَّهُ يُخْشٰى عَلَيْهِ الْكُفرَ ؛ لِاَنَّهُ ثَبَتَ بِالْخَبَرِ الْمُتَوَاتِرِ

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مقیم کے لئے جائز ہے کہ وہ موزوں پر ایک دن اور ایک رات (چوبیس گھنٹے) تک کی مدت کے لئے مسح کر سکتا ہے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں (۷۲ بہتر گھنٹے) تک جائز ہے، کیونکہ احادیث میں اسی طرح وارد ہوا ہے؛ اور جو شخص اس کا انکار کرتا ہے، اس پر کفر میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے؛ اس لئے کہ مسح کا حکم احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے۔

تشریح: امام اعظم کے نزدیک موزوں پر مسح کرنے کے لئے سات شرائط ہیں:

۱- پاؤں دھونے اور طہارتِ کاملہ کے بعد پہنا گیا ہو یعنی ایسے وقت پہنا گیا ہو جب اس پر غسل لازم نہ ہو۔

۲- موزوں نے پاؤں کو ٹخنوں تک چھپا لیا ہو؛

۳- مستقل طور پر انکو پہن کر چلنا ممکن ہو؛

۴- پاؤں کی چھوٹی تین انگلیوں کے برابر یا اس سے زیادہ نہ پھٹا ہوا ہو۵۔ موزہ باندھے یا پکڑے بغیر پاؤں پر جما رہے؛

۶- پانی کو جسم تک پہنچنے سے مانع ہو: کیونکہ اس کے باریک ہونے کی وجہ سے یا پھٹ جانے کی وجہ سے جسم تک پانی پہنچ گیا تو مسح باطل ہو جائے گا۔

۷- پاؤں کا اگلا حصہ کم از کم تین انگلی کی مقدار پاؤں کے ساتھ موجود ہو؛ اگر ایڑی موجود ہو، مگر پاؤں کا پنجہ موجود نہ ہو تو مسح جائز نہ ہوگا۔

ضروری تنبیہ: آج کل امریکہ اور یورپ میں بسنے والے مسلمان خصوصاً اور دیارِ مشرق میں عموماً اپنی پہنی ہوئی عام جرابوں پر مسح کر لیتے ہیں جو وہ جوتوں کے ساتھ رواجاً پہنتے ہیں؛ اس بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر وہ اتنی موٹی نہیں کہ پانی کو جسم تک پہنچنے سے روک سکیں یا مذکورہ شرطیں پوری نہ کرتی ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز نہیں گا؛ اور بلاوجہ ضد اور عناد کی وجہ سے اپنی نمازیں ضائع کرنا عقل مندی نہیں ہے۔

احادیث مبارکہ میں جو جوربینکے الفاظ ہیں وہ اردو زبان میں بولے جانے والے لفظ جراب کے معنوں میں نہیں ہیں؛ اور جب کوئی ایسا لفظ حدیث میں استعمال ہو جو کسی اور زبان میں بھی استعمال ہوتا ہو تو کسی ایسے عالم سے جو زمانہ نبوی کی عربی زبان اور اس زمانے کی اصطلاحات جانتا ہو معلوم کر لیا جائے؛ ورنہ اصطلاحات سفر (travel) کرتی ہیں۔ کبھی ایک لفظ کسی زبان میں ایک چیز کا نام ہوتا ہے تو دوسرے وقت میں وہ دوسرے کام کا نام بن جاتا ہے؛ اس لئے لفظی اشتراک سے حکم مشترک نہیں نکالا جا سکتا؛ لہذا جس چیز پر حکم لگایا گیا ہو پہلے دیکھا جائے کہ اپنی اصل کے لحاظ سے اس عمل کا کیا حکم ہے۔ یہ معلوم ہو چکنے کے بعد عمل کیا جائے؛ اور یہی فطری طریقہ ہے بلاوجہ کے ضد اور عناد میں مبتلا رہنا کہیں کی عقل مندی نہیں ہے۔

مسئلہ دوم قصر نماز، روزہ کے افطار کا حکم:

وَ الْقَصْرُ وَ الْاِفْطَارُ فِی السَّفَرِ رُخْصَةٌ بِنَصِّ الْکِتَابِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی:
وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (النساء:۱۰۱)

وَ فِی الْاِفْطَارِ قَوْلِهٖ تَعَالٰی
فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَرِیْضاً اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (البقرة:۱۸۴)

ترجمہ: اور سفر کے دوران نماز میں قصر کرنے؛ اور روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے؛ اور اس کی دلیل قرآن کریم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"جب تم زمین پر سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ دوران سفر لازم ہونے والی نمازوں میں تم قصر کر لیا کرو"

اور روزوں کے دوران سفر افطار کرنے کی رخصت اللہ تعالیٰ کے اس قول سے معلوم

ہو رہی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

''پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا وہ سفر میں ہو تو اس کو دوسرے دنوں سے ان (چھوڑے ہوئے) روزوں کی تعداد کو پورا کرنا ہے''

تشریح: یہ صرف قصر کا حکم چار رکعتوں والی نماز کے لئے ہے؛ اور نوافل، سنتوں وغیرہ میں تین اختلافی رائے ہیں

پہلی رائے یہ ہے کہ مسافر رخصت جانتے ہوئے سنتوں کو چھوڑ دے یا اللہ تعالی کا قرب جانتے ہوئے سنتوں کو ادا کرلے، دونوں طرح جائز ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ مسافر دوران سفر سنتیں چھوڑ دیں اور منزل پر پہنچ جانے تو جو نمازیں ادا کرے ان کو پورا ادا کرنا شروع کردے۔

تیسری رائے یہ ہے اور یہی صحیح رائے ہے کہ مسافر کو دوران سفر اگر کسی قسم کا خوف ہو تو سنتیں چھوڑ دینا اولی ہے، اور اگر اطمینانی کیفیت ہو تو سنتوں کو ادا کرنا اولی اور قابل ترجیح ہے؛ خواہ یہ سفر کسی ثواب کے کام کے لئے کیا جائے یا گناہ کے لئے کیا جارہا ہو۔

مسئلہ مسافر کی حد مسافت، اور مدت:

اگر کوئی شخص اپنے اصل مقام سے اڑتالیس میل یا اس کے مساوی مسافت کے لئے سفر کا ارادہ لے کر نکلے تو اپنے شہر کی حدود سے نکل جانے کے بعد مسافر کہلائے گا؛ اور ائرپورٹ (Airport) پر نماز قصر ہی پڑھی جائے گی کیونکہ عموماً یہ شہر سے باہر ہوتے ہیں اور ان کا حکم شہروں میں نہ ہونے کا ہے اور اس بارے میں یہی تعامل ہے؛ اور پندرہ دن یا اس سے کم تک مسافر ہی رہے گا؛ اور اگر کسی جگہ قیام کا ارادہ کر لیا تو نماز مکمل پڑھے گا؛ اسی طرح اگر امام مقیم کے اقتداء میں نماز پڑھے تو بھی پوری پڑھے گا؛ اور روزے کے افطار کے بارہ میں بھی اگر سفر کی مسافت اور اتنی ہی مدت کا ارادہ ہو تو مسافر کے حکم میں ہوگا ورنہ نہیں؛ اسی لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فمن كان منكم مريضا او على سفر فعدةٌ من ايامٍ اخر﴾

اگر کوئی شخص مریض ہو؛ یا سفر پر ہو تو رمضان کے روزوں کی قضاء ایام رمضان کے علاوہ دوسرے ایام سے گنتی پوری کرے۔

☆☆☆

دسویں علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں ایک مسئلہ بیان فرمایا گیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ اللہ تعالیٰ نے قلم سے صحیفۂ تقدیر لکھوالیا ہے

نُقِرُّ بِاَنَّ اللّٰہ تعالٰی اَمَرَ الْقَلَمَ بِاَنْ اُکْتُبْ !

فَقَالَ الْقَلَمُ مَاذَا اَکْتُبُ یَا رَبِّ ؟

فَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اُکْتُبْ مَاھُوَ کَائِنٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ ؛

لِقَوْلِہٖ تَعَالٰی وَکُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْہُ فِی الزُّبُرِ ؛ وَ کُلُّ صَغِیْرٍ وَ کَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ (القمر: ۵۳،۲)

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو ہر چیز کی تقدیر لکھنے کا حکم دیا، اور قلم سے اللہ تعالیٰ نے کہا: اے قلم لکھ!

اس قلم نے پوچھا میں کیا لکھوں؟ اے میرے رب!

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جو کچھ بھی قیامت تک ہونے والا ہے ان سب باتوں کو لکھ دے۔

اور ہمارے اس عقیدے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے جس میں فرمایا:

''اور ہر عمل جو انسان کرتے ہیں وہ ان کے نامۂ اعمال میں محفوظ کر دیا جاتا ہے اور ہر چیز خواہ چھوٹی ہو یا بڑی وہ لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہے''

تشریح: لوح محفوظ

لوح محفوظ کے بارے میں روایات میں منقول ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کر کے اور اس میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ قیامت تک ہونا ہے سب کچھ اس میں درج کر دیا ہے اور اس میں درج شدہ مندرجات کو

اللہ تعالی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

لوح محفوظ کی شکل وصورت مندرجہ ذیل کی چار باتیں ہم علامہ حسین بن اسکندرؒ کی تصنیف شرح الوصیہ نقل کرتے ہیں:

(۱) قال فی دقائق الاخبار: خلق اللّٰہ تعالی اللوح المحفوظ من درة بیضاء طوله مابین السماء والارض سبع مراة ، وعلقه بالعرش مکتوب فیه ماھو کائن الی یوم القیامة

دقائق الاخبار میں منقول ہے: کہ اللہ تعالی نے لوح محفوظ کو اتنے بڑے سفید موتی سے تخلیق کیا تھا جس کا سائز آسمان سے زمین کے درمیانی فاصلے سے بھی سات بار بڑا تھا، اور اس کو اپنے عرش مبارک کے سامنے لٹکا دیا ہے، اور اس میں قیامت تک ہونے والی ہر بات لکھی ہوئی ہے۔

(۲) وعن ابن مسعود رضی اللہ عنه مابین السماء والارض مسیرة خمس مائة عام ، کما فی تفسیر الخازن :وسعة الارض خمس مائة سنة ، البحار ثلاث مائة ، ومائة خراب ومائة عمران تمامه فی الدر المنثور

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ زمین وآسمان کے درمیان کا فاصلہ پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے جیسا کہ تفسیر خازن میں منقول ہے اور زمین کی وسعت بھی پانچ سو سال کے برابر ہے، ان میں سے سمندر تین سو سال کی مسافت کے برابر ہیں اور ایک سو سال کی مسافت کے برابر زمین اجاڑ اور بیابان ہیں جبکہ باقی ایک سو سال تعمیرات ہیں۔

(۳) وعن ابن عباس :رضی اللّٰہ عنهما :انه قال اول ما خلق اللہ تبارک وتعالی اللوح المحفوظ حفظه بما کتب فیه مما کان وما یکون ولا یعلم مافیه الااللہ تعالی ،وھو فی درة بیضاء قوائمه یاقوتتان حمراوان ، وھو فی عظم لایوصف ،وخلق اللہ تعالی قلما من جوھرطوله خمس مائة عام مشقوق اللسان ینبع النور منه کما ینبع من اقلام اھل الدنیا المداد.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ اللہ تبارک وتعالی نے سب سے پہلے لوح محفوظ کو پیدا فرمایا، اور اس میں ہر چیز قیامت تک کے لئے جو کچھ ہونا ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے، ان کو لکھ کر اس میں محفوظ فرما دیا ہے، اور اس لوح محفوظ میں جو کچھ بھی ہے اس کو اللہ تعالی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اور اس کو اللہ تعالی نے سفید موتی سے بنایا ہے جبکہ اس کی ٹانگیں سرخ رنگ کے یاقوت کی ہیں۔ اور سائز کے لحاظ سے وہ اتنا بڑا ہے کہ اس کو لفظوں میں نہیں لکھا جا سکتا۔ پھر اللہ تعالی نے جوہر سے قلم کو تیار کیا جس کی لمبائی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے، اس کی زبان (nib) درمیان میں سے کٹی ہوئی ہے جس میں سے نور نکلتا ہے، جیسے اہل دنیا کی قلموں میں سے سیاہی نکلتی ہے۔

(۴) وفی الھیئة السنیة للسیوطی :عن ابن عباس رضی اللہ عنه قال قال

رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله تعالى خلق لوحا احد وجهيه من ياقوتة حمراء والوجه الثانى من زمرد خضراء ، قلمه النور، فيه يخلق ، وفيه يرزق وفيه يحى وفيه يميت ، وفيه يعز وفيه يذل ،وفيه يفعل مايشاء فى كل يوم وليلة الى تقوم السماء

اور الھیئۃ السنیہ میں علامہ سیوطی نقل فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالی نے لوح محفوظ کو اس صورت میں پیدا فرمایا کہ اس کی ایک سائڈ سرخ رنگ کے یاقوت سے بنی ہوئی ہے، جبکہ اس کی دوسری سائڈ سبز رنگ کے زمرد سے بنی ہوئی ہے۔ اور اس پر لکھنے کے لئے قلم نور سے بنائی گئی، اور قیامت تک جو کچھ پیدا کیا جانا ہے اور جس کو جو رزق دیا جانا ہے، اور جو جب پیدا ہوگا اور جو جب مرے گا، اور جس کو جب عزت ملنی ہے اور جب اس کو ذلت دی جانی ہے، اور قیامت تک ہر وہ بات جو کسی بھی دن صبح یا شام کو اللہ تعالی نے انجام دینی ہے، وہ اس لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہے۔ الجوھرۃ المنیفۃ شرح الوصیۃ:٦

اس کو سفید رنگ کے موتی سے بنایا گیا ہے، اور اس کی ٹانگیں سرخ رنگ کے یاقوت کی بنی ہوئی ہیں ،اس کی بڑائی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا، اور اللہ تعالی نے قلم کو ایک خاص قسم کے جوہر سے بنایا ہے جس کی لمبائی پانچ سو سال کی مسافت جتنی ہے اور اس کی زبان کٹی ہوئی ہے اس سے نور جاری ہوتا ہے جیسے دنیا کی قلموں میں سے سیاہی جاری ہوتی ہے۔

ابوالحسن رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

قلم کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالی نے اس کو پکارا اور اس کو حکم دیا کہ لکھ!

آواز کی دہشت سے وہ قلم کانپ اٹھا حتی کہ اس میں سے رگڑ کی سی آواز پیدا ہوئی اور اللہ تعالی کی تسبیح پڑھتے ہوئے وہ اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہوا اور اس تسبیح کی آواز بادلوں میں بجلی کی کڑک کی مانند پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ لوح محفوظ پر چلنا شروع ہوا اور وہ کچھ اس میں اس نے لکھا جس کا اللہ تعالی نے اس کو حکم دیا تھا۔ اور جو کچھ قیامت تک ہونا تھا سب کچھ لکھ دیا۔ حتی کہ لوح محفوظ بھر گیا اور قلم لکھنے کے بعد خشک ہو گیا اور خوش بخت ہوا جو خوش بخت تھا اور بد بخت ہوا جو بد بخت تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل فرماتے ہیں:

ان الله تعالى اول شىء خلق القلم وهو من نور مسيرته خمس مائة عام وجرى بما هو كائن الى يوم القيامة فصدقوا بكل مابلغكم عن الله تعالى من قدرته وعظمته فهو القادر القاهر

اللہ تعالی نے سب سے پہلے جس مخلوق کو پیدا کیا وہ قلم تھا، اور اس کو نور سے بنایا تھا۔ اس کی مسافت پانچ سو برس کی تھی اور قیامت تک۔ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ سب کچھ اس نے لکھ دیا تھا، لہذا تم ہر اس بات کی تصدیق کیا کرو جو بات تمھیں اللہ تعالی کی قدرت اس کی عظمت کے بارے میں پہنچے۔ کیونکہ وہی ذات ہے جو ہر ایک پر قادر بھی ہے اور ہر ایک پر قاہر بھی ہے۔ (الجوھرۃ المنیفۃ شرح کتاب الوصیۃ:٢٠)

گیارھویں علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں پانچ مسائل بیان فرمائے گئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ اوّل عذابِ قبر کے بارہ میں:

نُقِرُّ بِأَنَّ عَذَابَ الْقَبْرِ كَائِنٌ لاَ مَحَالَةَ؛

ترجمہ: ہم اقرار کرتے ہیں کہ عذابِ قبر حق ہے اور جو اس عذاب کا مستحق ہوگا یہ اس شخص کو ضرور ہوگا۔

تشریح: انسان جب مرجاتے ہیں تو ان کو قبروں میں عذاب وثواب دیئے جانے کے بارے میں دو رائے ہیں۔

پہلی رائے تو یہ ہے کہ قبر میں نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے، اس میں دو قسم کے لوگ ہیں:

پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جو اپنے آپ کو اہل السنۃ والجماعۃ میں شمار کرتے ہیں اور ان کے نزدیک عذاب قبر سے مراد'' برزخ میں عذاب قبر'' ہے یعنی ان کے نزدیک مٹی کا یہ گڑھا جہاں ہم جا کر قبرستان میں میتوں کو دفنا کر قبر بنا آتے ہیں وہ شرعاً قبر نہیں ہے، بلکہ عالم برزخ میں ہر انسان کو جو قبر دی جاتی ہے وہ قبر مراد ہے۔ اور یہ ایک قسم کی عمدہ تاویل ہے

دوسری قسم کے لوگ وہ لوگ ہیں جو عذاب قبر کا سرے سے ہی انکار کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ میت تو پتھر کی مانند ہو جاتی ہے، لہذا اس کو عذاب کیسے ممکن ہے: علامہ تفتازانی فرماتے ہیں:

أنكر عذاب القبر بعض المعتزلة والروافض لأن الميّت جماد فتعذّبه محال. شرح عقائد نسفی باب عذاب القبر

بعض معتزلہ اور روافض نے عذاب قبر کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں چونکہ میت پتھر کی طرح ہوتی ہے لہذا پتھر کو عذاب ناممکنات میں سے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے اور اس پر اہل السنۃ والجماعۃ میں تمام ائمہ کا پورا اتفاق ہے کہ مردوں کو انھی قبروں میں زندہ کیا جائے گا اور انھیں قبروں میں ان کو جزاء وسزاء دی جائے گی اور ان کے نزدیک قبروں سے مراد یہی قبریں ہیں جہاں لوگ اس دنیا میں آرام فرما ہوتے ہیں اور لوگوں کو

جہاں دفنایا جاتا ہے اور ان مردوں سے اسی قبر میں سوال و جواب کئے جائیں گے جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے

عن ابی حنیفة عن رجل عن سعد بن عبادة رضی الله عنه : قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ، اذا وضع المؤمن فی القبر اتاه الملک ، فأجلسه، فقال من رب؟ فقال الله . قال ومن نبیک ؟ قال محمد ، قال وما دینک ؟ قال الاسلام ، فیفسح فی قبره ویری مقعده من الجنة . فاذا کان کافرا أجلسه الملک فقال من ربک ؟ فقال ها ه لاادری ، کالمضل شیئا ، فیقول من نبیک ؟ فقال هاه کالمضل شیئا . فیقال ما دینک ؟ فیقول هاه کالمضل شیئا . فیضیق علیه قبره ویری مقعده من النار (شرح مسند الامام الاعظم لملاعلی القاری)

رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی مؤمن کی میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کے پاس ایک فرشتہ آتا ہے اور اس کو اٹھا کر بٹھا دیتا ہے، اور اس میت سے سوال کرتا ہے تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے اللہ میرا رب ہے۔ پھر وہ پوچھتا ہے تیرا نبی کون ہے وہ جواب میں کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے نبی ہیں۔ پھر وہ پوچھتا ہے تیرا دین کونسا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے میرا دین اسلام ہے۔ اس کے بعد اس کی قبر کو اس کے لئے اتنا کشادہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ وہیں سے جنت میں اپنا مقام دیکھ لیتا ہے۔ لیکن جب کسی کافر کو قبر میں ڈالا جاتا ہے تو اس کے پاس ایک فرشتہ آتا ہے اور اس کو اٹھا کر بٹھا دیتا ہے، اور اس کے بعد اس میت سے سوال کرتا ہے تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب میں ''ھاہ'' کہتا ہے اس کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ وہ کیا کہے؟ اور وہ ایسا ظاہر کرتا ہے جیسے اس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ پھر وہ پوچھتا ہے تیرا نبی کون ہے؟ وہ جواب میں اسی طرح ''ھاہ'' کہتا ہے ایسا ظاہر کرتا ہے جیسے اس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ پھر وہ فرشتہ پوچھتا ہے تیرا دین کونسا ہے؟ وہ جواب میں پہلے کی طرح ''ھاہ'' کہتا ہے اور ایسا ظاہر کرتا ہے جیسے اس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو۔ اس کے بعد اس کی قبر کو اس کے لئے تنگ کر دیا جاتا ہے اور وہ وہیں سے جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھ لیتا ہے۔ اسی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا منقول ہے

اللهم انی اعوذبک من عذاب القبر

اے اللہ! میں قبر میں آپ کے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں۔ اللہ تعالی قبر کی مصیبت سے محفوظ فرمائے اور ہمارے نزدیک عذاب قبر کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جسم مع روح کو ہوگا چاہے وہ جسم مٹی میں مل جائے۔ تو بھی اس کو جو عذاب دیا جاتا ہے وہ جسم کو اس کی روح سمیت عذاب دیا جائے گا۔

سوال: اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ قبر میں انسان کے گوشت اور جسم کو کس طرح عذاب ہوگا جبکہ اس میں روح ہی نہیں ہوگی؟

جواب: اس کا جواب یوں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی سوال کیا گیا تھا کہ یارسول اللہ جب جسم قبر میں رکھا جائے گا اور اس میں روح نہیں ہوگی تو اس کو عذاب کیسے محسوس ہوگا؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا:

کما یوجع سنک ولم یکن فیه الرّوح

جس طرح تیرے دانت کو درد محسوس ہوتی ہے حالانکہ اس میں روح تو ہوتی نہیں ہے (الجوهرة المنیفة: ۲۲)

خلاصہ کلام یوں ہوا کہ جس طرح دنیا میں انسان ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتا ہے؛ اور یہاں کی ہر چیز فانی ہے مگر جنت یا دوزخ میں چونکہ اجر و جزاء ملنے کا آخری اور حتمی مرحلہ ہے، لہٰذا انسان کے ساتھ ہی اس کا وجود بھی ہوگا دونوں پر فنا نہیں ہوگی؛

نوٹ: وزن اعمال کے بیان میں اگرچہ وزن اعمال کے بارے میں عقل اس انداز سے تسلیم کرنے سے قاصر ہے کیونکہ اعمال ایک کیفی چیز ہیں جبکہ وزن کئے جانے کے لئے کمیت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جدید سائنسی اکتشافات اور انکشافات نے انسان کو ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ اب اس کو اس قسم کی باتیں ماننے میں کوئی مانع نہیں رہا کہ اس طرح اعمال یا کیفی اشیاء کو تولا جانے لگے۔ اسی لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے

فمن ثقلت موازینه فاؤلٰئک ھم المُفلحون

جن لوگوں کے نامہء اعمال میں اچھے عملوں کا وزن زیادہ ہوگا وہ کامیاب و کامران ہو جائیں گے۔

واما من خفت موازینه فاؤلٰئک الذین خسرو انفسھم بما کانوا بآیاتنا یظلمون

اور جن کے اعمال کا وزن ہوگا یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا میں ہوتے ہوئے اپنے ساتھ زیادتی کی، اس وجہ سے کہ دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشانی آجانے کے باوجود یہ لوگ اپنے ساتھ ظلم اور زیادتی کیا کرتے تھے۔

مسئلہ دوم قبر میں منکر اور نکیر کے بارہ میں:

وَ نُقِرُّبِاَنَّ سُؤَالُ الْمُنکَرِ وَ النَّکِیْرِ حَقٌّ؛ لِوُرُوْدِ الْاَحَادِیْثِ.

ترجمہ: اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ منکر نکیر کے ذریعے قبر میں جو سوالات پوچھے جائیں گے وہ حق ہیں۔

کیونکہ ان باتوں کا احادیث میں اس کثرت سے ذکر کیا گیا ہے کہ گویا احادیث متواترہ کے حکم میں ہیں۔

مسئلہ سوم جنت اور دوزخ:

وَنُقِرُّ بِأَنَّ الْجَنَّةَ وَ النَّارَ حَقٌّ .وَ هُمَا مَخْلُوْقَتَانِ الْآنَ ؛ لَاتَفْنِيَانِ وَلَا يَفْنِيْ اَهْلُهُمَا ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى فِيْ حَقِّ الْمُؤْمِنِيْنَ :

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (آلعمران: ۲۴)

وَ فِيْ حَقِّ الْكُفَّارِ

أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ (آلعمران: ۱۳۱)

خَلَقَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى لِلثَّوَابِ وَ الْعِقَابِ .

ترجمہ: اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جنت اور جہنم حق ہیں؛ اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہیں جن پر فناء نہیں ہے؛ اور نہ ہی ابد الاباد تک کبھی اس میں رہنے والوں پر فنا آئے گی،

جنت کے مؤمنوں کے لئے ہونے کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

"یہ جنت متقی لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے"

اور جہنم، اور اہل جہنم کے بارہ میں ارشادِ باری ہے

"جہنم کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے"

اور جنت اور دوزخ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے اچھے اعمال کی جزاء یا برے اعمال کی سزا دینے کے لئے بنایا ہے۔

مسئلہ چہارم میزان

وَنُقِرُّ بِأَنَّ الْمِيْزَانَ حَقٌّ ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ (الانبیاء: ۴۷)

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ حَقٌّ ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (الاعراف: ۹)

اور ہم اقرار کرتے ہیں کہ: میزان حق ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ساتھ اعمال کو تولیں گے''۔

اور اسی طرح اعمال کا وزن قیامت کے دن کیا جانا حق ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

''جس کے اعمال اس دن بھاری ہوئے وہ تو کامیاب لوگوں میں سے ہوگا، اور جس کے اعمال ہلکے ہوئے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہوگا جنھوں نے اپنا ہی نقصان کیا، اور ان کے اس نقصان کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ لوگ ہماری آیات کے ساتھ ظلم کیا کرتے تھے''۔

مسئلہ پنجم قیامت کے دن اعمال نامہ پڑھا جانا:

ونُقِرُّ بِأَنَّ قِرائَةَ الْكِتَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَقٌّ ؛ لِقَوْلِهِ تَعَالىٰ

وَ نُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَاباً يَّلْقٰهُ مَنْشُوراً اِقْرَءْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْباً (الاسراء: ۱۴،۲)

ترجمہ: اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ قیامت کے دن اعمال نامہ کا پڑھا جانا بھی حق ہے؛ کیونکہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''یعنی اور ہم قیامت کے دن ان کے اعمال نامے کو کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے پھیلا دیں گے اور کہا جائے گا پڑھو اپنی کتاب؛ اور یہ اعمال نامہ تیرے محاسبہ کے لئے کافی ہے''۔

دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَمَّا مَن اُوتِی کِتَابَه بِیَمِینه فیقول هٰؤم اقرؤا کتابیه﴾

یعنی جس شخص کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا، وہ لوگوں کو خوشی سے یہ کہتا پھرے گا؛ یہ لو میری کتاب اس کو پڑھ کر دیکھو اس میں کیا لکھا ہے۔

بارھویں علامت اور اس میں مذکور مسائل

اس علامت میں پانچ مسائل بیان فرمائے گئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے

مسئلہ اوّل مردوں کو دوبارہ زندہ کیا جانا:

نُقِرُّ بِأَنَّ اللّٰه تَعَالٰی یُحْیِی هٰذِهِ النُّفُوْسَ بَعْدَ الْمَوْتِ؛ وَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ فِی یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ لِلْجَزَآءِ وَ الثَّوَابِ وَ اَدَاءِ الْحُقُوْقِ ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی:

وَ اَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (الحج:۷)

ترجمہ: ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد ان تمام جانوں کو زندہ کرے گا اور سب کو ایک ایسے دن میں اکٹھا کرے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے؛ اور اس دن تمام انسانوں کو بدلہ دینے کیلئے اور ان کے اعمال کا ثواب دینے کے لئے اکٹھا کرے گا؛ اور ہر ایک شخص پورے پورے حقوق ادا کئے جائیں گے اور

یوم لا تظلم نفس لنفسٍ شیئاً

اس دن کسی جان کے ساتھ کوئی ظلم یا زیادتی نہیں کی جائے گی۔

اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جانا اللہ تعالی کے اس ارشاد کی بنا پر ہے:

''اللہ تعالی قبروں میں سے سب مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا''

تشریح: شیخ علی بن عثمان الدوسی فرغانی موت اور مابعد الموت کے بارے میں اپنے معروف قصیدہ بدء الامالی میں ارشاد فرماتے ہیں

وفی الاجداث عن توحید ربی — سیلی کل شخص بالسوال

و للكفار والفساق يقضى | عذاب القبر من سوء الفعل
دخول الناس فى الجنات فضلا | من الرحمن يا اهل الامال
حساب الناس بعد البعث حق | فكونوا بالتحرز عن وبال
ويعطى الكتب بعضانحويمنى | وبعضا نحوظهرا والشمال
وحق وزن اعمال وجرى | على متن الصراط بلا اهتبال

ومرجوشفاعة اهل خير
لاصحاب الكبائر كالجبال

(قصيدة بدء الامالى)

ہر شخص سے قبر میں توحید باری تعالیٰ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔اور کافروں اور فاسقوں کے بارے میں ان کی بدعملیوں کی وجہ سے عذاب قبر کا فیصلہ کیا جائے گا۔اللہ تعالیٰ سے امیدیں لگانے والے لوگوں کے لئے اس کے فضل وکرم کی بناء پر جنت میں داخلے کا فیصلہ کیا جائے گا

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھایا جانا،اوراس کے بعد حساب وکتاب ہونالازم ہے،اس لئے ایسے اعمال سے بچو جو وہاں کی مشکلات میں ڈال دیں۔وہاں بعض لوگوں کو دائیں ہاتھ میں اور بعض لوگوں کو بائیں ہاتھ میں یا کمر کے پیچھے سے اعمال نامے دئے جائیں گے۔

اوراس کے بعد اعمال کا تولا جانا اور پل صراط سے گزرنا ہر ایک پر لازم وحق ہے۔اور تمام اہل خیر شفاعت رسول کے متمنی ہوں گے اور پہاڑوں کی مانند گناہوں کا بوجھ اٹھانے والے بھی شفاعت کے متمنی ہوں گے۔

مسئلہ دوم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی حقیقت:

وَنُقِرُّ بِأَنَّ لِقَاءَ اللّٰهِ تَعَالٰى حَقٌّ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ بِلَا كَيْفٍ وَلَا كَيْفِيَّةٍ وَ لَا تَشْبِيْهٍ وَ لَا جِهَةٍ ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى :

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾

ترجمہ:اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جنتی لوگوں کے لئے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہونا حق ہے اور یہ ملاقات بلا کسی کیفیت،اور بلا کسی تشبیہ کے ہوگی اور نہ ہی اس زیارت باری تعالیٰ کے لئے کوئی جگہ متعین ہوگی کہ جس طرف سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکے گا اوراس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اور بہت سارے چہرے اس دن خوش وخرم حالت میں اپنے پروردگار کی طرف دیکھ

رہے ہوں گے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کی ملاقات دنیا میں بعض انبیاء کو ان آنکھوں سے بھی ہوئی اور ایسی رؤیۃ دنیاء میں انبیاء کے لئے حق ہے؛ جیسے رسول اللہ نے شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا؛ یہ رؤیۃ غیر انبیاء کو حاصل نہیں، البتہ خواب میں غیر انبیاء کے لئے بھی حق ہے؛ جیسے امام اعظمؒ نے ایک سو سے زیادہ مرتبہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا؛ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا؛ اسی طرح اولیاء کرام کا مکاشفات میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا، جو اصل میں خواب ہی کے ہم معنی ہوتے ہیں؛ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ: اولیاء کرام کی کتب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے جتنے واقعات ملتے ہیں، یہ سب عالم مکاشفہ یا عالم رؤیا کے واقعات ہوتے ہیں اور ان کا حکم خواب سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔

البتہ اہل التشیع کا عقیدہ ہے کہ: ان کے امام کا الہام اور کشف بمنزلہ وحی ہوتا ہے؛ اور اسی لئے ان کے نزدیک امام اپنے الہام سے بعض اوقات قرآنی آیات کو منسوخ کر دیتے ہیں؛ جبکہ اہلِ السنّت والجماعت کے ہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے؛ اور بعض اصحاب کو دیکھا کہ وہ مکاشفات پر بنیاد رکھ کر آئمہ تصوف کی تغلیط اور ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں؛ اس سے پرہیز لازم ہے؛ معلوم نہیں کہ انسان مخالفت کرنے میں حد سے تجاوز کر جائے یا وہ شخص واقعی اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے ہو؛ اور کسی ولی اللہ کی مخالفت یا اس سے ضد و عناد اللہ تعالیٰ کو محاربہ یا اپنے خلاف جنگ کی دعوت دینا ہے اور اس سے ایمان سلب کر لئے جانے کا اندیشہ ہے؛ اور اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے ان باتوں سے بچنا لازم ہے۔

اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کی دلیل یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وجوہ یومئذ نا ضرۃ الی ربھا ناظرۃ

قیامت کے دن بہت سارے چہرے تروتازہ ہوں گے اور وہ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا شبہ دور کر دیا جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کسی اور روپ (shape) میں ہوگی۔

مسئلہ سوم شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

وَ شَفَاعَۃُ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ حَقٌّ لِکُلِّ مَنْ ھُوَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ ، وَ اِنْ کَانَ صَاحِبَ الْکَبِیْرَۃِ

ترجمہ: اور تمام اہل جنت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت حق ہے، چاہے وہ گناہ کبیرہ کا ہی مرتکب کیوں نہ ہوتا رہا ہو۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن شفاعت کا عمل اتنا عام ہوگا کہ ابلیس جیسا لعین بھی اس بات کی امید کرے گا کہ اس کو بھی کسی نہ کسی کی شفاعت میسر آجائے گی۔

عن ابی حنیفة عن جواب بن عبید الله التمیمی عن الحارث بن سوید رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال : ان ابلیس الابالس لیتطاول یوم القیامة رجاء ان تناوله الشفاعة لما یری من نفوذ شفاعتی یوم القیامة (الامام الاعظم والثنائیات: ۳۵۶)

جیسے کہ امامؒ نے متنِ فقہِ اکبر ۴۷ میں ارشاد فرمایا۔

مسئلہ چہارم امت میں سے افضل ترین عورت

وَنُقِرُّبِأَنَّ عَائِشَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهَا وَ خَدِیْجَةَ الْكُبْرٰی اَفْضَلُ نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ وَهِیَ اُمُّ الْمُؤْمِنِیْنَ مُطَهَّرَةٌ عَنِ الزِّنَاءِ و بَرِیْئَةٌ عَمَّا قَالَتِ الرَّوَافِضُ ؛ فَمَنْ شَهِدَ عَلَیْهَا بِالزِّنَا فَهُوَ وَلَدُ الزِّنَا وَ كَافِرٌ ؛

ترجمہ: اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ سارے جہاں کی عورتوں میں افضل ترین ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا اور حضرت عائشہؓ صدّیقہ ہیں؛ اور وہ دونوں ام المؤمنین ہیں اور ام المؤمنین حضرت عائشہ پر جو روافض کی طرف سے زنا کا (معاذ اللہ) الزام لگایا جاتا تھا، آپ اس سے پاک اور بری ہیں، اور اس کے بعد جو شخص بھی ان پر زنا کا الزام لگائے گا وہ خود ولدِ زنا اور کافر ہے۔

تشریح: اہل سنت والجماعت کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات آپ کے اہل بیت میں شامل ہیں بخلاف روافض کے وہ ازواج مطہرات کو اہل بیت میں شامل نہیں کرتے۔اسی لئے امام طحاوی نے بہت عمدہ فرمایا ہے:

> ''اس بارے میں عمدہ ترین بات یہ ہے کہ تمام اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات اور آل واولاد کے بارے میں اچھی رائے رکھی جائے جو ایسا کرتا ہے وہ نفاق سے بری ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتی ہیں:

عن ابی حنیفة عن عبد الملك بن عمیر قال قالت عائشة رضی الله تعالی عنها لنساء النبی صلی الله علیه وسلم فضلنی الله علیكن بعشر خصال ولا فخر، كنت احب نسائه الیه ،وكان ابی احب اصحابه الیه ، ولم یعرف بكرا غیری وتزوجنی بسبع وبنی بی لتسع ، ونزل فی عذری من السماء ، وكان یطاف به فی مرضه بین نسائه فقال هذا یشق علی ان

رأيتن ان تأذن وأكون فی بيت عائشة فقالت ام سلمة أذنا فكان آخر زاده من الدنيا أتی بمسواک فقال انكثيه يا عائشة ففعلت ثم استاک به فجمعالله بين ريقی وريقه ، وقبض الله بين سحری ونحری ، ودفن فی بيتی (الامام الاعظم والثنائيات: ۳۵۳)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ازواج مطہرات میں بیٹھے ہوئے ایک دن ارشاد فرمایا مجھے اللہ تعالی نے تم پر دس باتوں میں فضیلت دی ہے لیکن میں اس پر کوئی فخر نہیں کرتی (۱): میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے محبوب بیوی تھی (۲): اور میرے والد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے سب سے محبوب صحابی تھے (۳): میرے سوا آپ کی کوئی بیوی کنواری نہ تھی (۴): آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مجھ سے نکاح کیا تو میری عمر اس وقت سات برس تھی اور جب میری آپ کے ہاں رخصتی ہوئی تو میری عمر نو برس کی تھی (۵): میری معذرت کے بارے میں اللہ تعالی نے آسمان سے کلام نازل فرمایا (۶): جب آپ مرض الوفات میں تھے تو آپ اپنی ازواج کے ہاں باری باری جاتے تھے تو آپ کو اس سے بڑی مشقت ہوتی تھی تو آپ نے اپنی ازواج مطہرات سے اجازت چاہی کہ میں عائشہ کے گھر میں رہوں تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ہم راضی ہیں (۷): آپ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو آخری خوراک استعمال کی وہ مسواک تھی جو آپ نے مجھ سے چبانے کو کہا اور پھر مجھ سے مانگا، اور میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور آپ نے سب سے آخر میں وہ مسواک استعمال فرمائی (۸): اس طرح اللہ تعالی نے میر العاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب ایک جگہ جمع فرمادیا (۹): اللہ تعالی نے آپ کی جان اپنے قبضے میں کی جبکہ آپ میرے سینے اور گلے کے درمیان ٹیک لگائے ہوئے تھے (۱۰): اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں دفن ہوئے ہیں

اور عقیدہ طحاویہ کے شارح علامہ عبدالمعز صحیح مسلم سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک آب گاہ جس کا نام خم تھا وہاں ہمارے درمیان کھڑے خطبہ ارشاد فرمارہے تھے بعد از حمد وصلوۃ اے لوگو میں تمہاری طرح کا بشر ہوں، اور ہوسکتا ہے اللہ تعالی کے پیغام لانے والے میری طرف آئیں اور میں اللہ تعالی کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے اپنے پروردگار کے پاس چلا جاؤں، لیکن میں تمہارے لئے دو مضبوط چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں اس میں (ایک) تو اللہ تعالی کی کتاب جس میں اللہ تعالی کی طرف سے ہدایت اور نور ہے اس کو مضبوطی سے تھامے رہنا اور اپنی مشکلات میں اس سے استدلال کرتے رہنا، اور اللہ کی کتاب کی اہمیت کے بارے میں اور بھی باتیں ارشاد فرمائیں۔ اور اس کے بعد فرمایا (دوسرا) میرے اہل بیت ہیں اور میرے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالی کے احکامات وفرامین کو یاد رکھنا، اور یہ بات تین بار ارشاد فرمائی''۔ (شرح عقیدۃ الطحاویہ: ۴۱۷)

مسئلہ پنجم آخرت میں دائمی بدلہ دیا جائے گا

وَنُقِرُّ بِاَنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ فِی الْجَنَّةِ خَالِدُوْنَ ؛ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی فِیْ حَقِّ الْمُؤْمِنِیْنَ:

اُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرة:۳۹)

وَ اَهْلُ النَّارِ فِی النَّارِ خَالِدُوْنَ ، وَ فِیْ حَقِّ الْکُفَّارِ:

اُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (البقرة:۲۱۷)

ترجمہ: اور ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جنتی لوگ، دائمی طور پر جنت میں رہیں گے؛ اس بات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ:

یہی لوگ جنتی ہیں، اور یہ جنت میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے اور جہنمی لوگ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے، کیونکہ کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے بارہ میں ارشاد فرمایا:

یہی لوگ جہنمی ہیں اور یہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔

تشریح: اس مسئلے کے بارے میں تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ جنت اور دوزخ دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور پیدا شدہ ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں اور قیامت تک وہ اسی صورت میں رہیں گی، البتہ معتزلہ اور فرقہ قدریہ کا ایک گروہ ایسا ہے جنہوں نے ان کے بارے میں ایسا عقیدہ رکھنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پیدا فرمائیں گے۔
(شرح عقیدۃ الطحاویہ: ۳۵۰)

بحمد اللہ ان کلمات پر حضرت امام اعظم کی تمام اُمت کے نام آخری وصیت اپنے اختتام کو پہنچی۔

خاتمہ

امام اعظم کی وصیت عامہ

کے آخر میں وہ وصیت جو حضرت امام اعظم نے اپنے بیٹے

حضرت امام حماد رحمۃ اللہ علیہ

کو فرمائی تھی آئندہ صفحات میں

ہدیہ قارئین کر رہے ہیں

کہ وصیت عامہ کی افادیت دوچند ہو جائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی پانچ وصیتیں

یا بنیّ اَرشدکَ اللّٰہ وایّدک ، اُوصیک بِوصایا ، ان حفظتَھا وحافظت علیھا رجوتُ لکَ السَّعادۃَ فی دینک ودُنیاک ؛ ان شاء اللّٰہ

(اوّلھا) : اَلتَّقوی بحفظ جوارِحک من المعاصی خوفاً من اللّٰہ تعالی ، والقیام باَوامرہ عبودیۃً لہ تعالی ؛

(والثانی) : ان لا تَستقرّ علی جھلٍ ماتحتاجُ الی علمہ

(والثالث) : اَنْ لا تُعاشِرَ شَخصاً اِلاّ مَن تحتاجُ الیہ فی دینک ودنیاک ؛

(والرابع) : اَن تُنصف مِن نفسک ولا تُنصف لھا الا لضرورۃٍ

(والخامس) : ان لا تُعادِی مسلماً او ذمّیًا ؛

ترجمہ: اے میرے بیٹے! اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت کے راستے پر ثابت قدم رکھے، اور تیری تائید ونصرت فرمائے! میں تجھے چند وصیتیں کرتا ہوں اگر تم ان کو یاد کر کے ان پر عمل کرتے رہو گے، تو میں تمہارے لئے ان شاء اللہ دنیا وآخرت کی سعادت مندی کی امید کرتا ہوں۔

پہلی وصیت

ہر قسم کے گناہوں سے اپنے اعضاء اور جوارح کی حفاظت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے

ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنا (تقویٰ کا راستہ اختیار کرنا) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس کے احکام پر پوری طرح قائم رہنا، اور ان تمام باتوں میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبودیت آپ کے پیش نظر رہنی چاہیے۔

دوسری وصیت:

زندگی میں کسی بھی وقت جس چیز کے جاننے کی ضرورت پیش آسکتی ہو اس کے جاننے سے ہرگز جاہل نہ رہنا، بلکہ اس کے جاننے کی فکر کرتے رہنا، تاوقتیکہ وہ تمہارے علم میں آجائے۔

تیسری وصیت:

کسی ایسے آدمی کے ساتھ جس سے دین یا دنیا کا فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو، اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات قائم نہ رکھنا۔

تشریح: ہاں اگر کسی سے دنیا یا دین کا فائدہ حاصل ہونے کی امید، اس کے ساتھ تعلقات رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ ایک تو غنائے نفس کی کیفیت حاصل ہوگی، اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگوں کی نظروں میں آپ کا مقام بلند ہو جائے گا اور آپ کے علمی رعب اور وقار میں اضافہ ہوگا۔ اس طرح آپ کے قریب وہی شخص آئے گا جس کو آپ سے کوئی علمی فائدہ مقصود ہوگا اور آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں ہوگا۔

چوتھی وصیت:

اپنے آپ کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا کرنا اور کسی دوسرے سے انصاف کا مطالبہ نہ کرنا، ہاں جب سخت ضرورت ہو تو انصاف کا مطالبہ کرنا، اللہ تعالیٰ تیری مدد کرے گا۔

تشریح: اس بات کا مطلب یہ ہے کہ: اگر کسی دوسرے شخص کے حقوق آپ کے ذمے واجب الاداء ہوں تو ان کی ادائیگی میں کوئی دیر نہ کرنا، بلکہ احسن طریقے سے ادا کرنا، البتہ اگر آپ کا کوئی حق کسی دوسرے شخص کے ذمے واجب الاداء ہو تو اس سے مطالبہ نہ کرنا، اسلئے کہ اگر تو وہ شخص جاہل ہوا جو انصاف کے لفظ کو بھی نہ جانتا ہو تو وہ آپ کی عزت میں طعن کرے گا، اور آپ کی ناقدری کرے گا۔ ہاں اگر سخت ضرورت ہو اور اس کے بغیر کام نہ چلتا ہو تو احسن انداز سے مطالبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

پانچویں وصیت:

یہ ہے کہ زندگی میں کسی مسلمان یا کسی ذمی (غیر ملکی) سے دشمنی نہ اختیار کرنا۔

تشریح: کیونکہ اس دشمنی میں وقت کا ضیاع بھی ہے اور دولت کا ضیاع بھی ہے۔ اس طرح دشمنی اختیار کرنا ذہنی پریشانی اور الجھاؤ کا باعث بھی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سے دشمنی کرنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا جیسے کوئی شخص دار الحرب سے یا کسی دوسرے ملک سے آیا ہو اور اس کے ساتھ چپقلش ہو جائے۔ اس کے ساتھ دشمنی اختیار کر لینے سے وہ شخص دین کو بھی بدنام کرے گا اور ملک کو بھی بدنام کرے گا اور آپ کو بھی بدنام کرے گا اور خاص طور سے اہل علم کو بدنام کرنا تو ان کو بہت اچھا لگے گا اور یوں اہل دین کی بدنامی سے دین الٰہی بدنام ہوگا۔ اس لئے ایسے شخص سے درگزر کا معاملہ کیا کرنا۔

☆☆☆

دوسری پانچ وصیتیں

(والسّادس) : اَنُ تقنَع مِن اللہ بِمَا رَزقَک مِن مالٍ اَو جاہٍ ؛

(والسّابع) : اَن تحسنَ التّدبیر فی ما فی یدِک اِستغناءً به عن النَّاسِ ؛

(والثّامن) : عَلی اَن لا تستھین عین الناس علیک

(والتّاسع): اَن تقمع نفسک من الخوض فی الفضول

(والعاشر): اَن تَلقَی النّاس مُبدئاً بالسّلام ، مُحسناً بالکلام ، مُتَحبّباً الی اھل الخیر ، مداریاً لاھل الشّر

ترجمہ:

چھٹی وصیت:

اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا میں جو مال و دولت اور جاہ وعزت عطاء کی ہے اس پر صبر اور قناعت سے کام لینا۔

تشریح: قناعت اہل ایمان کے لئے ایک بہترین عادت ہے اور اس سے انسان کی ایمان کی سلامتی کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون بھی میسر رہتا ہے اس لئے کہ جو بلندی اور ترقی مقدر میں ہے وہ مل کر رہے گی۔ اگر مقدر میں نہیں تو وہ مل نہیں سکتی۔ اس لئے بلاوجہ ایسی باتوں کے پیچھے نہ پڑنا جس کا حاصل وصول کچھ نہ ہو۔

ساتویں وصیت:

جو کچھ تمہارے پاس ہو اس کے بارے میں عمدہ انداز سے انتظامات کرنا، اور اپنے ذاتی قسم کے معاملات میں لوگوں سے استغناء اور بے نیاز ہونے کی کوشش کرنا۔

تشریح: استغناء ایک ایسا مفید عمل اور اچھی عادت ہے جس سے لوگ آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اسی بات کو بعض احادیث میں زہد کے نام سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی لئے کسی عارف کا قول ہے:

وازهد فی ما عند الناس یحبک

کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے استغناء اور زہد اختیار کرو گے تو لوگ آپ سے محبت کرنے لگیں گے۔

آٹھویں وصیت:

زندگی میں کسی بھی کام کو کرنے کے لئے ایسا طریقہ اختیار نہ کرنا، جس سے لوگوں کی توہین آمیز اور ذلیل کرنے والی نظریں، تمہاری طرف اٹھنے لگیں۔

تشریح: بعض لوگ اپنے آپ کو ملامتیہ کہلا کر ایسی باتیں یا حرکتیں کیا کرتے ہیں جس سے وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ملامت کی جائے اور ان کی طرف انگلیاں اٹھائی جائیں۔ ایسی بات اگر عوام الناس میں سے کوئی شخص کرے پھر تو ٹھیک ہے، لیکن اگر علماء اور وہ بھی اہل اللہ اور اونچے درجے کے اہل علم ایسا کام کرنے لگیں، اس سے نہ صرف ان کی بدنامی، بلکہ دین کی بدنامی بھی ہوگی اور اس سے لوگ دین پر طعن و تشنیع کرنا شروع کر دیں گے۔ اس لئے اس قسم کی باتوں سے ہر ایک کو پرہیز کرنا چاہیے، لیکن اہل علم واہل تقوی کو اس کا خاص اہتمام کرنا چاہیے کہ ان سے کوئی ایسی بات صادر نہ ہو جو ان کے اور دین کے لئے حرف طعن بن جائے۔

نویں وصیت:

فضولیات اور لایعنی کاموں میں غور و فکر کرنے سے، اپنے آپ کو بچانا۔

دسویں وصیت:

جب تم لوگوں سے ملو تو سلام کرنے میں پہل کرنا، بات کرنے میں نیکی کے پہلو کو پیش نظر رکھنا، نیکوکاروں سے محبت کیا کرنا، اور بدوں کے ساتھ خاطر مدارت والا معاملہ کیا کرنا۔

تشریح: تیرے سلام میں پہل کرنے کے طریقہ کار سے نیکوکاروں کے دل میں تیری محبت پیدا ہوگی، اور اللہ والوں کی محبت اللہ تعالی کی محبت کا باعث بن جائے گی۔ یہ ولایت کا وہ مقام ہے جس کے بارہ میں ارشاد خداوندی ہے:

والذین آمنوا اشد حبا للہ

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ تعالی سے زیادہ محبت کیا کرتے ہیں۔

یہ مقام تجھے حاصل ہو جائے گا اور بدوں کو سلام میں پہل کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ بدوں کی بدی سے اللہ تعالی اس طرح بچائیں گے کہ ان کے شر سے محفوظ رہ سکو گے، اللہ تعالی اس بات سے ہمیں مستفید فرمائے۔

تیسری پانچ وصیتیں

(والحادی عشر): ان تکثر ذکر اللّٰہ تعالی والصّلاۃ علی رسولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم

(والثّانی عشر) :ان تشتغل بسیّد الاستغفار، وھو قولہ علیہ السّلام :

" اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَااِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَھْدِکَ وَوَعْدِکَ مَااسْتَطَعْتُ ، اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ ، اَبُوْؤُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَبُوْؤُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّہٗ لَایَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ "

من قَالَھَا حینَ یُمسِی فَمَات لیلتِہ دخلَ الجَنَّۃ ، ومَن قالَھَا حِینَ یُصبِح فَماتَ مِن یَومِہ دَخلَ الجَنَّۃ.

وعن ابی الدرداء رضی اللّٰہ عنہ حین قیل لہ احترق بیتک ! قال مااحترق ! لکلمات سمعتھن من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من قالھا اوّل نھارہ لم تصبہ مصیبۃ حتی یمسی ، ومن قالھا آخر نھارہ لم تصبہ حتّی یصبح

" اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَااِلٰہَ اِلَّااَنْتَ ، عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ، مَاشَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَالَمْ یَشَاءُ لَمْ یَکُنْ ، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ، اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْماً ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ ، وَمِنْ شَرِّ کُلِّ ذِیْ شَرٍّ ، وَمِنْ شَرِّ کُلِّ دَابَّۃٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا ، اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ "

(والثالث عشر): ان تواضبَ علی قِرائۃِ القرآنِ کُلّ یومٍ ، وتَھدی ثَوابَھا اِلی رَسُول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وَ وَالدَیکَ ، وَاَسَاتِیذِکَ وَسَائِرِ المُسلِمِینَ .

(والرّابع عشر) :اَن تَحتَرِزَ مِنْ اَصحابکَ اَکثر من اَعدائکَ اِذ کَثُر فِی النَّاسِ الُفَسادَ ، فعدوُّک من صِدِّیقِک مُستفَادٌ

(والخامس عشر):اَن تَکتُمَ سِرَّکَ وَذَھَبکَ ومَذُھَبکَ وذِھَابکَ

ترجمہ:

گیارھویں وصیت

اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا کرو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود پاک پڑھنے کی عادت ڈالو۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے کا حکم خود اللہ رب العالمین نے دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

یاایھا الذین آمنوا اذکروا الّٰہ ذکرا کثیرا

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ارشاد نبوی ہے:

قال ابو حنیفة عن علی بن الاقمر عن الاغر عن النبی صلی الله علیه وسلم : انه مرّ بقوم یذکرون الله تعالی ، فقال انتم من الذین امرتُ ان اصبر نفسی معهم ، وما جلس عدتکم من الناس یذکرون الله تعالی الا حفتهم الملائکة باجنحتها ، وغشیتهم الرحمة وذکر الله فی من عنده

(الامام الاعظم والثنائیات:ص ۳۶۲)

امام اعظم نے اپنے استاد علی بن اقمر سے، انھوں نے حضرت الاغرؓ سے اور انھوں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ آپ کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول تھے، تو آپ نے فرمایا تمھیں وہ لوگ ہو جن کے بارے میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ جڑا رہوں اور جب بھی کوئی لوگ اکٹھے بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو ملائکہ ان کو اپنے پروں کے ساتھ گھیرے میں لے لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو ڈھانپ لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ اپنے پاس جو مقربین ملائکہ ہیں، ان میں کیا کرتے ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت کے ساتھ درود پاک بھیجا جائے جو بڑی سعادتوں

، رحمتوں، برکتوں، قربتوں، بلندیوں، وسعتوں، کا حامل ہے اور اللہ تعالی کا قرب حاصل کرنے کا ایک محبتوں بھرا اور کامل، مجرب نسخہ ہے، لیکن اس میں نیت کی پاکیزگی شرط ہے، کہ بندے کے سامنے اس وقت صرف۔ اور صرف اللہ تعالی کی ذات یا ذات پیغمبر ہو۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات اس کے سامنے نہ ہو، اور اس پاکیزہ عبادت کو ہر قسم کی باطنی آلائشوں سے بچایا جائے اور ایسے کلمات سے پرہیز کیا جائے جو کسی کو برائی کی طرف مائل کر دے۔ اور ایسا درود پاک جو دوسروں کو ضد و عناد میں مبتلاء کر دے اس سے اعراض کر لینے میں دین و دنیا کی بہتری اور سعادت ہے۔

بارھویں وصیت

اکثر و بیشتر سید الاستغفار کے کلمات پڑھنے میں مشغول رہا کرو، اور اس کے کلمات جو رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے منقول ہے اور وہ اوپر متن میں مذکور ہیں، اور اس کا ترجمہ یوں ہے:

اے اللہ تو میرا پروردگار ہے، تیرے علاوہ میرا کوئی معبود نہیں اور میں تیرا ہی بندہ ہوں اور میں اپنی استطاعت کے مطابق تیرے ساتھ کئے ہوئے وعدے اور عہد پر قائم ہوں۔ اے اللہ! میں آپ کی پیدا کردہ ہر ایک چیز کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، میں اقرار کرتا ہوں تیرے سامنے ان تمام نعمتوں کا جو تیری طرف سے مجھ پر کی گئی ہیں، اور میں اقرار کرتا ہوں اپنے سارے گناہوں کا، بس آپ مجھے معاف فرما دیں کیونکہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں جو گناہوں کی بخشش کر سکتا ہو۔

جو شخص ان کلمات کو شام کے وقت کہتا ہے اور اسی رات کو وہ مر جائے تو سیدھا جنت میں داخل ہوگا، اور جو شخص ان کلمات کو صبح ہونے کے وقت کہے، اور پھر وہ اسی دن مر جائے تو وہ سیدھا جنت میں داخل ہو جائے گا۔

اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن کسی نے ان سے کہا کہ آپ اطمنان کے ساتھ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، جبکہ آپ کا تو گھر جل گیا ہے! اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرا گھر نہیں جل سکتا۔ انھوں نے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے تو آپ نے فرمایا چند کلمات ہیں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہیں۔ پ نے فرمایا جو شخص ان کو دن کے وقت پڑھ لے تو شام تک اس کو کوئی مصیبت نہیں پہنچے

گی اور جو شخص ان کلمات کو دن کے آخری حصے میں پڑھ لے تو اس کو رات کے وقت یہاں تک کہ صبح طلوع ہونے تک کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی۔

کلمات اوپر متن میں مذکور ہیں۔ ان کا ترجمہ یوں ہے:

''اے اللہ تو میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تجھی پر میں نے بھروسا کیا، اور تو ہی عرش عظیم کا پروردگار ہے، جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اور جو وہ نہیں چاہتا، وہ نہیں ہوسکتا، بڑی بلندیوں اور عظمتوں والے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جس کی طرف سے نیکی کرنے کی طاقت حاصل ہو اور نہ گناہوں سے بچنے کی استطاعت کسی کے پاس ہے، میں اس ات کا اعتقاد رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر قدرت رکھنے والا اور ا۔پنے کامل علم کے ذریعے ہر ایک کا احاطہ کرنے والا ہے، اے اللہ! میں اپنے نفس کے شر سے، اور ہر شریر کے شر سے، اور ہر شر والی مخلوق کے شر سے، جو آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے آپ ہی کی پناہ چاہتا ہوں، بلاشبہ میرا پروردگا سیدھا راستہ دکھانے والا ہے۔

تشریح: اس میں جو دعائیں حضرت امام اعظم نے ارشاد فرمائی ہیں وہ بہت ہی مفید اور بڑی ہی مجرب ہیں، لہٰذا ہر پڑھنے والے کو چاہئے کہ ان کو زبانی یاد کرلے اور ہم نے یاد کرنے کی سہولت کی خاطر ان پر اعراب بھی لگادئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان بابرکت کلمات سے استفادے کی صحیح معنوں میں توفیق نصیب فرمائے۔

تیرھویں وصیت:

ہر روز قرآن کریم کی تلاوت میں باقاعدگی کرنا، اور اس کا ایصال ثواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے والدین، اور اپنے اساتذہ، اور تمام مسلمانوں کو کیا کرنا۔

تشریح: یہ بات آج کل بعض پڑھے لکھے لوگوں میں عام ہوتی جارہی ہے کہ مرنے والے کو ایصال ثواب کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسی سوچ والے افراد اگر امام اعظم کو مانتے ہیں تو ان کی راہنمائی کے لئے مذکورہ نصیحت کافی ہونی چاہئے۔ بلاوجہ کی ہٹ دھرمی اور ضد بازی کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے راستے پر رہنے کے لئے ضروری ہے کہ امام اعظم کے فرامین کو اپنی راہنمائی کے لئے پیش نظر رکھا جائے اور اہل علم کا راستہ بھی یہی ہے، لیکن آج کل بعض جہلا نے اس میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی ہے اور

ایصال ثواب کوانہوں نے کاروبار کوروپ دے دیا ہے، اور اسی کاروبار میں انھوں نے بعض مخصوص رسمیں اختیار کرلی ہیں جن رسومات کا نہ دین میں اور نہ دنیا میں کوئی فائدہ ہے۔ ایصال ثواب کی محافل میں انھی مخصوص رسومات کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر ان کو پورا کیا جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ رسم ایصال ثواب کے لئے ٹھیک ہے اور اگر اس سے سرمو تفاوت کیا جائے تو بعض نادان حتی کہ بعض دین سے ناآشنا دنیاوی لحاظ سے پڑھے لکھے لوگ بھی اس کو اہل سنت کے راستے سے ہٹا ہوا گمان کرتے ہیں، اور دوسرے طرف ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو ایصال ثواب اور اس کے سارے طریقہ کار کو ہی بدعت وضلالت اور گمراہی تصور کرتا ہے۔ اس لئے چند بنیادی باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے میت کو ایصال ثواب بھی پہنچ جائے گا اور ہر قسم کی بدعات سے اجتناب بھی ہو سکے گا۔

(۱) ایصال ثواب کا کوئی وقت نہیں ہے کہ اس وقت ثواب کیا جائے اور کسی دوسرے وقت ثواب نہ کیا جائے، بلکہ نیک عمل کر کے کسی بھی وقت ثواب پہنچایا جاسکتا ہے، لہٰذا جو ہم خود ایسے اوقات متعین کر لیتے ہیں کہ فلاں وقت یا فلاں دن ہو یہ سب ہماری اپنی باتیں ہیں۔ اجر ثواب کے لحاظ سے اس کو کوئی اہمیت نہیں۔ ہاں انتظامی اہمیت ہو تو اور بات ہے۔ جیسے مثلاً ساتویں دن یا تیسرے دن یا دسویں دن یا گیارہویں دن یا چالیسویں دن یہ سب ہماری اپنی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ ان کا دین نبوی علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲) جو قرآن کریم پڑھنا ہے یا کوئی ذکر دعا تسبیح پڑھنی ہے اس کی مقدار ایصال ثواب کے لئے متعین نہیں ہے، بلکہ ایک کلمہ پڑھ کر بھی اس کا ثواب کسی کو بخشا جاسکتا ہے اور ایک قرآن کا بھی، اور اسی طرح بہت سارے ذکر واذکار کا ثواب بھی میت کو بھیجا جاسکتا ہے۔ اس لئے نیک عمل جتنا بھی ہو جائے اتنا ہی کافی ہے، لیکن نیت کی درستگی، اور اخلاص ومحبت کے ساتھ وہ عمل کیا جانا چاہئے، مزدوری، یا قرض سمجھ کر کہ انہوں نے ہماری میت کے لئے ستر قرآن کا ثواب دیا تھا ہم اسی قرآنوں کا ثواب دیں یہ رسومات دین کی اہمیت کم کرنے والی اور دین کی عظمت کم کرنے والی ہیں۔ اس لئے ایسی باتوں سے مکمل اجتناب کرنا چاہئے تاکہ دین کی اہمیت عام لوگوں کی نظروں میں کم نہ ہو۔

(۳) ایصال کے لئے جو دعا مانگی جاتی ہے اس کا کوئی مخصوص طریقہ مشروع نہیں ہے۔ بعض جگہوں پر یہ رسم بنی ہوئی ہے کہ دعا سے پہلے ایک گلاس دودھ، ایک گلاس پانی، ایک نیا ان سلا کپڑوں کا سوٹ، ایک خوب صورت جوتا، وغیرہ وغیرہ ایک لمبی لسٹ بنائی جاتی ہے جو ایک لایعنی سا کام ہے اس سے لوگ یہ سمجھتے ہیں شاید ان باتوں کے بغیر ایصال ثواب نہیں ہوتا اور ان باتوں کو ایک دین یا مذہب کا مقام دے دیا گیا ہے جبکہ یہ رسومات ہیں۔ اس کو ثواب کی نیت سے نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اگر انہی باتوں کو ثواب سمجھ کر کر لیا جائے تو بدعت کے زمرے میں شامل ہو جانے کا اندیشہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر قسم کی بدعات سے محفوظ فرمائے۔

(۴) ایصال ثواب کے لئے اس محفل میں کسی مخصوص شخصیت کا ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ کوئی بھی

نیک آدمی دعا کروادے، اللہ تعالی دعا قبول کرنے والے ہیں یا خود پڑھنے والا دعا کروادے تو بھی اللہ تعالی کے ہاں دعا پہنچ جائے گی اور قبولیت وعدم قبولیت اللہ تعالی کی مرضی پر منحصر ہے، ہاں ایصال ثواب ضرور ہو جائے گا، اس کے لئے صرف نیت کی ضرورت ہے دعا نہ بھی کی جائے تو بھی ایصال ثواب ہو جاتا ہے۔ ہاں دعا چونکہ اللہ تعالی کو محبوب ہے، اس لئے دعا ضرور کی جانی چاہئے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دعا مانگنے کا کیا فائدہ ہے جب پہلے ہی ہم نے نیت کرلی تھی، دعا بھی ایک عبادت ہے۔ اللہ تعالی کی محبوب اور پسندیدہ عبادت ہے اور بندوں کی بندگی کی علامت ہے۔

اس لئے اللہ تعالی کی رضا کے لئے جب بھی، جتنا بھی اور جو شخص بھی پڑھ لے، وہی ایصال ثواب کا اچھا طریقہ ہے، ہاں بعض اوقات بعض انتظامی ضروریات کے پیش نظر کوئی وقت متعین کر لیتے ہیں اور اس کو صرف انتظامی ضرورت ہی سمجھا جاتا ہے اس کو شرعی مسئلہ تصور نہیں کرتے تو ایسی محافل میں شمولیت یا انعقاد، اس میں کوئی حرج نہیں اور بلاوجہ ایسی باتوں کو موجب طعن وتشنیع اور موردالزام بہتان بازی نہ کیا جانا چاہئے۔ واللہ الموفق والمعین

چودھویں وصیت:

دشمنوں سے زیادہ دوستوں کے شر سے بچنے کا اہتمام کیا کرنا۔ کیونکہ لوگوں میں طبیعتوں کا فساد زیادہ ہو گیا ہے، اور اکثر تمہارے دشمن دوستوں میں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

تشریح: دوستوں سے زیادہ احتیاط کے لئے جو یہ نصیحت فرمائی گئی ہے یہ اصل میں بہت ہی قیمتی بات ہے کیونکہ دنیا میں عام محاورہ بھی ہے کہ ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے''

جو آپ کے زیادہ قریب ہوتا ہے وہ ہی آپ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے، اس لئے آپ تو ں پر اعتماد کر لیتے ہو، لیکن وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو چکا ہوتا ہے، لہذا ضروری ہے کہ دشمن ے زیادہ اپنے دوست سے احتیاط کی جائے تاکہ اس سے یا آپ سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جائے جو صان کا باعث بن سکے۔

درھویں وصیت:

عام لوگوں کے سامنے اپنے راز کو راز رکھنا، اپنے مال کو مخفی رکھنا، اپنی (نجی) گھریلو ندگی کو سرعام بیان نہ کیا کرنا، اور اپنا منزل مقصود بیان نہ کیا کرنا۔

(صلی اللہ تعالی علیہ وسلم تسلیما کثیرا الف الف مراۃ کما ینبغی لجلال وجھک وعدد کلماتک کما تحب وترضی)

تشریح: بعض حکماء کا یہ قول ہے ''تین چیزوں کو چھپاؤ زن زر زمین'' اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو آج کی دنیا میں اکثر فتنے انہی تین باتوں میں بے احتیاطی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ہر آدمی کی نجی زندگی خوشیوں اور غموں سے معمور ہوتی ہے۔ اس میں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جلتی زندگی ہوتی ہے، اس لئے بعض اوقات انسان کسی شخص کے بارے میں بلند خیال اپنے ذہن میں رکھتا ہے تو اس کی نجی زندگی کے بارے میں جاننے کے بعد اکثر اس کی اہمیت کم کر لیتا ہے اس لئے نجی زندگی کو عام لوگوں کے سامنے بیان نہ کرنا ہی فائدے کا باعث ہوتا ہے، اسی وجہ سے بعض لوگ انبیاء کی نبوت کا یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں:

مال ھذا الرسول یأکل الطعام ویمشی فی الاسواق

یہ کیسا رسول ہے جو بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے پھرتا ہے اور عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے۔

(۲) سونا یا مال و دولت بھی انسان کی عزت و عظمت کے اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اگر کسی کو نہ بتا یا جائے کہ میرے پاس کس قدر سونا چاندی مال و دولت ہے تو لوگ عام زندگی کو دیکھ کر بڑے مرعوب ہوتے ہیں اور اگر ان کے سامنے اس بات کو بتا دیا جائے تو اس سے لوگوں کے ذہنوں میں بنی ہوئی عزت ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا اپنی دولت کو اپنی حفاظت میں ہی رکھا جانا چاہئے۔ تاکہ کسی بھی قسم کے فتنہ و فساد سے بچا جا سکے۔

(۳) اپنی معاشرتی زندگی اور گھریلو حالات لوگوں کے سامنے نہ بتانا چاہئے اس لئے کہ اس طرح لوگوں کی نظروں میں اہمیت کم ہو جائے گی، اور خاص طور سے گھریلو عورتوں کے بارے میں تو اس بات کا خاص اہتمام کیا جانا چاہئے کہ وہ لوگوں کی نظروں اور کانوں سے محفوظ رہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مغربی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے گھریلو خواتین کو بازاری چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ کسی کاروبار میں، کسی پبلسٹی میں کسی ٹی وی کے اشتہار میں، کسی پراڈکٹ کی پیکنگ پر کسی آفس یا فیکٹری کے سائن بورڈ پر آپ دیکھیں تو آپ وہاں عورت کی تصویر ضرور نظر آئے گی جو یقیناً صنف نازک کے جنسی استحصال کے ساتھ ساتھ مالی استحصال کا بھی ایک بھیانک ذریعہ ہے۔ اور عورتیں بھی اپنی معصومیت کی وجہ سے، مکار مردود حضرات کی آلۂ کار بن جاتی ہیں جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آج ہماری معاشرتی زندگی کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہے، اور بچے اپنی ماؤں کی محبت بھائی اپنی بہنوں کی چاہت، اور رشتے دار اپنے رشتوں کی شیرینی سے محروم ہو چکے ہیں، اور نتیجہ یہ ہے کہ آج ہر بچہ اپنی حقیقی بہن اور ماں کو چھوڑ کر کوئی نہ کوئی منہ بولی بہن یا ماں تلاش کئے ہوئے ہے، جو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ہم نے اپنی معاشرتی زندگی کو کس انداز میں تباہ و برباد کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

(۴) منزل مقصود کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا دوران سفر بھی موزوں نہیں ہوتا اس لئے کہ آپ سے آپ کی منزل مقصود کے بارے میں جان کاری حاصل کرنے والا فرد نہ جانے کیسا ہو، اور وہ آپ کے بارے میں اپنے ذہن میں کیا باتیں رکھتا ہو، اس لئے ہر کس و ناکس کے سامنے اپنا مدعا بیان نہ کرنا چاہئے تاکہ بلاوجہ کی شرور سے بچا جا سکے۔

چوتھی پانچ وصیتیں

(والسادس عشر) :ان تُحسنَ الجَوار ، وتَصبرِ علیٰ اذی الجارِ

(والسابع عشر):ان تمسّک بمذهب اهل السنّة والجماعة ، وتجتنبَ عن اهل الجِهالة ، وذَوی الضّلالة

(والثامن عشر) : ان تُخلص النّيّة فی اُمورک ، وتجتهد فی اکل الحلال علی کل حالٍ

(والتاسع عشر) : ان تعملَ بخمسة احاديثٍ جمعتُها من خمس مائة الفٍ :

(۱): اِنّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ وَلِكُلِّ اِمْراءٍ مَانَوٰی .

(۲): مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ.

(۳): لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی يُحِبُّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ .

(۴): اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَالْحَرَامَ بَيِّنٌ ، وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتَ اِسْتَبْرَاءَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ ، وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ ، كَرَاعٍ يَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی يُوْشِكُ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًی ، اَلَا اِنَّ حِمَی اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ ، وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ ، وَهِيَ الْقَلْبُ

(۵): اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ

(والعِشرون) : ان تکونَ بین الخَوفِ والرَّجآء فی حالِ صحَتک ، وتموتَ بحُسن الظَّنّ باللہ ، وغلبۃُ الرَّجآء بقلبٍ سلیمٍ ؛ ان اللہ غفورٌ الرَّحیم

ترجمہ:

سولہویں وصیت

پڑوسیوں کے لئے حسن سلوک کیا کرنا اور اگر کسی ہمسائے سے اذیت یا تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کیا کرنا۔

سترہویں وصیت

اہل السنۃ والجماعۃ کے راستے کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا اور اہل جہالت اور گمراہوں کے راستے سے اجتناب کیا کرنا۔

تشریح: امام اعظم کے زمانے میں چونکہ فرقہ واریت کا زمانہ شروع ہو چکا تھا اور امت متعدد فرقوں میں بٹ چکی تھی رافضی ، شیعہ ، معتزلہ ، خوارج ، زیدیہ ، مرجیہ ، جبریہ ، قدریہ ، جہمیہ ، وغیرہ قسم کے بہت سارے فرقے معرض وجود میں آچکے تھے اس لئے لازم تھا کہ درست راستے کی تعیین کے بعد اس کا کوئی نہ کوئی نام تجویز کیا جاتا اس مقصد کے لئے اہل السنّت والجماعت کا نام تجویز کیا گیا اور اس تجویز کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پیش نظر رکھا گیا۔ جس میں آپ نے فرمایا:

تفترق امتی بملی ثلاث وسبعین ملة کلھم فی النار الا ملة واحدة قالو من ھی یا رسول للہ قال ما انا علیه واصحابی

میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے صرف ایک جنت میں جائے گا اور باقی سب جہنم میں جائیں گے۔ عرض کیا گیا کہ: وہ کون سا فرقہ ہے یا رسول اللہ؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: وہ لوگ جو میرے اور میرے اصحاب کے راستے پر ہوں گے۔ یہ نام اہل السنّت والجماعت کا نام چنا گیا۔ بقول مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ

"یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان تمام فرقوں کا اصل بانی عبداللہ بن سباء یمنی صنعانی یہودی ہے، جو مسلمان ہو گیا تھا، لیکن زمانہ صحابہ میں نہایت شدید منافق رہا، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں تمام جھگڑوں کی اصل اور اسلام میں کتر بیونت کرنے والا یہی ہے، اور اس کے بعد جو ہوئے وہ سب اسی کی ذریت اور اسی کا فیض خبث ہے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بعض لکھنے والوں

نے اسی تاریخی پس منظر کو نظر انداز کیا ہے" (امام اعظم ابوحنیفہ: ۳۳۹)

اور چونکہ امام اعظم کے زمانے میں فرقہ واریت شروع ہو چکی ہے تھی اور ہر فرقہ والے اس بات کے مدعی تھے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پرست ہیں، اور ہر ایک کا دعوی حق پرستی پر نظر کرنا ضروری ہے اس لئے ہم مختصر انداز میں عرض کرتے ہیں کہ جو آجکل ہمارے ہاں ماحول بن چکا ہے ہر شخص اپنے آپ کو حق پر اور مدمقابل کو باطل پر سمجھنے کا عادی بن چکا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا مفہوم سمجھیں۔

(۱) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے وقت کے بارے میں خبر دی ہے، آئندہ زمانے میں ایسا ہوگا، ترغیب نہیں دی کہ تم ایسا ضرور کرنا لہذا کسی فرقے میں شامل ہونا یا فرقہ واریت میں مبتلا ہونا کوئی محمود عمل نہیں اور نہ ہی اسلامی شریعت میں مرغوب عمل ہے، بلکہ اس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ جب ہر طرف گمراہی کا دور دورہ ہوگا تو ہم اس گمراہی کی گرم بازاری کے خریدار نہ بن جائیں، بلکہ اس سے اعراض کریں اور صحیح راستے پر چلنے کی کوشش کریں

(۲) صحیح راستے کی تعیین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نشانی بتائی ہے، وہ بڑی ہی واضح ہے۔ اور ایسا راستہ وہ ہے جس پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور جس راستے پر آپ کے صحابہ کرام بعد میں قائم رہے ہیں، حدیث نبوی کے الفاظ یوں ہیں:

ما انا علیه و اصحابی

جس راستے پر میں محمدؐ اور میرے صحابہ کرامؓ ہوں گے

اور اسی سے لفظ اہل السنۃ والجماعۃ بنایا گیا ہے کیونکہ دوسرے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ترکتُ فیکم امرین لن تضلّوا ماتمسکتم بهما کتاب اللّٰه و سنّتی

یعنی میں تمہارے لئے دو باتیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم ان پر کاربند رہو گے تو تم گمراہ نہیں ہوسکو گے، ان میں (پہلی) اللہ تعالی کی کتاب اور (دوسری) بات میری سنت ہے، ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یوں ہے:

اہل السنت والجماعۃ سے مراد ایسی جماعت کے افراد ہیں جو اللہ تعالی کی کتاب کو اپنے مسائل کے حل میں بنیادی حیثیت دیتی ہو اور جو بات کتاب اللہ میں نہ ملے وہاں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ کی طرف رجوع کرتا ہو، اور جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین میں نہ ملتی ہو وہاں اصحابؓ پیغمبر کے تعلیمات کی طرف متوجہ ہوتا ہو۔

اسی بات کی طرف حضرت امام اعظم نے راہنمائی فرمائی ہے:

عن یحی بن ضریس قال شهدت سفیان الثوری واتاه رجل له مقدار فی العلم والعبادة ، فقال له : یا ابا عبد الله ! ما تنقم علی ابی حنیفة ؟ قال وما

له ؟قال سمعته يقول قولا فيه انصاف وحجة: وانى آخذ بكتاب الله اذا وجدته ، فما لم اجده فيه اخذت بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم والآثار الصحاح عنه التى فشت فيه ايدى الثقات عن الثقات ، فاذا لم اجد فى كتاب الله ولا سنة رسول الله اخذت بقول اصحابه من شئت وادع قول من شئت ، ثم لا اخرج عن قولهم الى قول غيرهم ، فاذا انتهى الامر الى ابراهيم ، والشعبى ، والحسن ، وعطاء ، وابن سيرين، وسعيد بن المسيب ، وعدد رجالا ، فقوموا قد اجتهدوا فلى ان اجتهد كما اجتهدوا ، قال : فسكت سفيان طويلا ، ثم قال كلمات برأيه مابقى فى المجلس احد الاكتبها (امام اعظم کی وصیتیں:۲۶۰)

یحیی بن ضریس فرماتے ہیں کہ میں سفیان ثوریؒ کے پاس تھا کہ ان کی مجلس میں ایک ایسا آدمی حاضر ہوا جو علم وعبادت میں معروف لگتا تھا، اور ان سے کہنے لگا کہ آپ امام ابوحنیفہ پر تنقید کیوں کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا یہ آپ کیا بات کررہے ہیں؟ اس نے کہا میں نے ابوحنیفہ کو ایسی بات کہتے ہوئے سنا ہے، اور جس میں انصاف اور حجۃ تامہ بھی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ میں دین کے معاملات میں سب سے پہلے اللہ تعالی کی کتاب سے اس کا حل تلاش کرتا ہوں، اور اگر وہاں سے حل نہ ملے تو میں ایسی سنت سے استنباط کرتا ہوں جو صحیح ترین آثار میں سے ہو، اور اس کی نشانی یہ ہے کہ جس کو ثقہ افراد ثقہ سے نقل کرتے آئے ہیں، جب کوئی بات کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں سے نہ ملے تو میں اقوال صحابہ میں سے نقل شدہ بات اس انداز سے لیتا ہوں کہ جو عمل کے لئے زیادہ موزوں ہو اور جو موزوں نہ ہو اس کو ترک کردیتا ہوں، اس کے بعد کسی اور کے اقوال کی طرف میں توجہ نہیں کرتا، اور جب بات ابراہیم، شعبی، حسن، عطاء، ابن سیرین، اور سعید بن مسیب اور اسی طرح کے اور کئی افراد کا شمار کیا اور کہا کہ جب بات اس قسم کے افراد تک پہنچتی ہے تو جس طرح وہ اجتہاد کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی اجتہاد کریں گے، سفیان ثوری یہ بات سن کر کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے اس کے بعد اپنی مجلس میں اپنی رائے سے کچھ باتیں کیں جو تمام حاضرین مجلس نے لکھ لیں۔

یہی اہل السنۃ کا طریق ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالی کی کتاب سے اور اس کے بعد احادیث نبویہ اور اس کے بعد اجماع امت کا درجہ ہے کیونکہ اہل السنۃ کے نزدیک اقوال صحابہ کا مقام احادیث نبویہ کی مانند ہے اور اس کے بعد اجتہاد کا درجہ ہے یہی چار اصول ہیں جس پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ میں شامل ہونے کے لئے ادلۂ اربعہ پر یقین رکھتا ہو اس لئے ہمیں بھی چاہئے کہ اسی راستے پر ہم قائم ودائم رہیں۔

(۳) آج کل یہ فیشن ہو گیا ہے کہ اہل باطل بھی اپنے کو اہل السنۃ قرار دینے لگے ہیں اور دوسری طرف اس قدر وسعت ذہنی آگئی ہے کہ ہم اہل السنۃ کو بھی ایک فرقہ سمجھ کر اس کی مخالفت میں کھڑے

ہو جاتے ہیں، اور جب کوئی پوچھے آپ کون ہیں تو کہتے ہیں ہم الحمدللہ 'مسلمان' ہیں، لیکن یہ بات واضح طور پر معلوم ہونی چاہئے کہ جب مختلف ادیان کے لوگ جمع ہوں اور اس وقت اگر پوچھا جائے آپ کون ہیں؟ تو اس وقت صحیح جواب یہ ہے کہ میں 'مسلمان' ہوں۔ اگر سارے مسلمان بیٹھے ہوئے ہوں تو اس وقت پوچھا جائے آپ کون ہیں؟ تو اس وقت درست جواب یوں دیا جائے گا کہ میں 'اہل السنۃ' یا 'اہل التشیع' میں سے ہوں۔ لیکن اگر کسی محفل میں پہلے سے ہی بہت سارے اہل السنۃ جمع ہوں اور سوال کیا جائے کہ آپ کون ہیں تو اس وقت درست جواب یوں ہوگا کہ میرا تعلق اہل السنۃ میں سے 'ماتریدی' یا 'اشعری' یا 'حنبلی' مکتبہ فکر سے ہے۔

(۴) عام طور پر اس کو فرقہ واریت سمجھ کر اس کی برائی کی جاتی ہے جبکہ فرقہ واریت میں کوئی برائی نہیں اصل برائی اس جنگ وجدل میں ہے جو ایک شخص اپنے آپ کو سچا اور دوسروں کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے کرتا ہے، اور اسی کی برائی شریعت میں کی گئی ہے اور یہی ناپسندیدہ عمل ہے، اور اس سے اجتناب کی ضرورت ہے۔

اٹھارویں وصیت

اپنے تمام کاموں میں اخلاص نیت کا شیوہ اختیار کرنا، اور ہر حال میں حلال کھانے اور حلال کمائی کی عادت اختیار کرنا۔

انیسویں وصیت

ان پانچ احادیث پر ضرور عمل کیا کرنا جن کو میں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے چنا ہے:

پہلی حدیث: ''بے شک تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ دیا جائے گا''۔

دوسری حدیث: ''کسی شخص کے اسلام لانے کے بعد اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں لایعنی کاموں سے رک جائے''۔

تیسری حدیث: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

چوتھی حدیث: ''بے شک اسلامی تعلیمات میں حلال بھی واضح ہیں اور حرام بھی واضح ہیں، اور ان دونوں کے درمیان جو غیر واضح ہیں وہ مشتبہ ہیں، جن کے بارے میں اکثر لوگ صحیح تعلیمات نہیں رکھتے۔ بس جو شبہات والی باتوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اس نے

اپنے دین اور اپنی عزت وآبرو کو بچالیا، اور جو شخص شبہات والی باتوں میں دل چسپی لیتا ہے اس کے بارے میں خطرہ ہے کہ وہ حرام میں مبتلاء ہو جائے گا۔

یاد رکھو! ہر بادشاہ کی کوئی نہ کوئی چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالی کی چراگاہ اس کے حرام کردہ کام ہیں۔

یاد رکھو! ہر انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ تندرست ہوتا ہے تو سارا جسم تندرست ہوتا ہے، اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم اس کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے، اور وہ انسان کا دل ہے''۔

پانچویں حدیث: ''صحیح مسلمان وہ شخص ہوتا ہے جس کی زبان اور ہاتھ کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں''۔

تشریح: انسان جب بھی کوئی کام کرتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں پہلی اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہو، دوسری اس کا کوئی نقصان ہو، تیسری اس کا نہ فائدہ اور نہ ہی اس کا کوئی نقصان ہو، اس تیسری صورت کو حدیث میں لایعنی سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی ایسا کام کرنا جس کا دینی لحاظ سے یا دنیاوی لحاظ سے کوئی فائدہ نہ ہو، ایسے کاموں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے وقت ضائع ہوتا ہے، لیکن اس ضیاع کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

اسی لئے اہل معرفت کے ہاں لایعنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''لایعنی میں مشغول ہونے سے انسان کے نیک اعمال کی رونق ختم ہو جاتی ہے''۔ لہذا کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا کام کیا جائے جو دنیا میں کسی کام آئے۔ اول تو ایسا کام کیا جائے جو دنیا وآخرت دونوں کے کام آئے، اگر ایسا نہیں تو کم از کم دنیا میں تو کام آئے، اس لئے لایعنی سے بچنا بہر حال ضروری اور مفید ہے

بیسویں وصیت

تم اپنی صحت وتندرستی کے دوران ہر حال میں اللہ تعالی کے عذاب کا خوف، اور اس کی بخشش کی امید اپنے پیش نظر رکھو، اور جب تمہیں موت آئے تو اللہ تعالی کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اس دنیا سے جانا اور اللہ تعالی کی طرف سے بخشش کی غالب امید دل میں بسی ہوئی ہو، اور یہ کیفیت تمہارے قلب سالم کے ساتھ ہونی چاہئے کیونکہ اللہ تعالی بخشنے والے مہربان ہیں۔

دعاء المغفرة و النّجاة

پاک ہے وہ اللہ جو ابد الابد سے ہے، پاک ہے وہ اللہ تو ایک اکیلا ہے

پاک ہے وہ اللہ جو یکتا و بے نیاز ہے، پاک ہے وہ اللہ جس نے آسمان کو بغیر ستون کے بلند کیا ہوا ہے، پاک ہے وہ اللہ جس نے جمے ہوئے (گلیشئر) پانی پر زمین کو ٹکا دیا ہے، پاک ہے وہ اللہ جس نے لاتعداد مخلوقات کو پیدا کیا اور ان کی تعداد کو بھی وہ اچھی طرح جانتا ہے، پاک ہے وہ اللہ جو سب مخلوقات کی زندگی کا سامان اور روزی مہیا کرتا ہے اور کسی کو بھی نہیں بھولتا، پاک ہے وہ اللہ جس نے نہ کوئی بیوی بنائی اور نہ اولاد بنائی، اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر اس کے برابر ہے

حامداً و مصلیا ، و مسلما ،

اولا ، و آخرا ، و ظاهرا ،

و باطنا.

☆

کتابیات

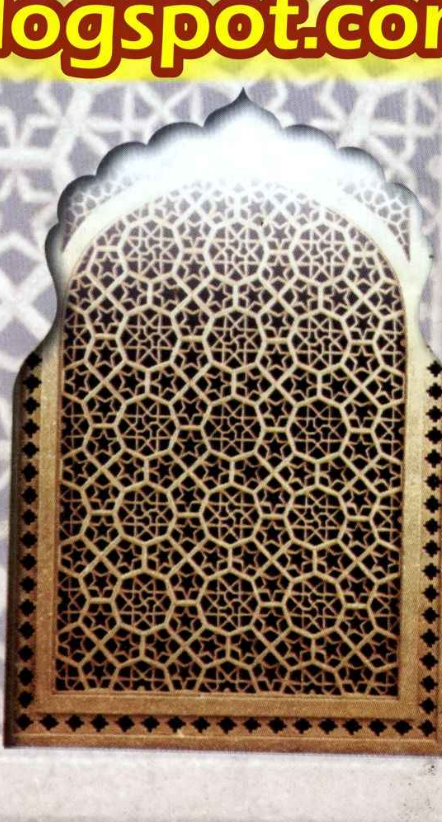
قرآن کریم
تفسیر الخازن
تفسیر الدر المنثور
تفسیر روح المعانی
الصحیح بخاری
الصحیح مسلم
السنن ترمذی
السنن ابوداود
السنن نسائی
السنن ابن ماجہ
جامع المسانید الخوازمی
مسند امام اعظم
الثنائیات امام اعظم
عشرین لابی حنیفہ رشید احمد العلوی
الصحیح ابن حبان
مسند احمد بن حنبل
الاصل (المبسوط) محمد بن حسن الشیبانی
المبسوط السرخسی
الجامع الصغیر محمد بن حسن الشیبانی
الجامع الکبیر محمد بن حسن الشیبانی
السیر الصغیر محمد بن حسن الشیبانی
السیر الکبیر محمد بن حسن الشیبانی
السیر الاوسط محمد بن حسن الشیبانی
الزیادات محمد بن حسن الشیبانی
امام ابوحنیفہ کی تابعیت عبدالشہید نعمانی
الجوہرۃ الممنیفۃ
فلسفے کے بنیادی مسائل
مسند ابی حنیفہ راوی الحارثی
مسند ابی حنیفہ راوی حماد بن ابی حنیفہ مخطوط
شرح مسند امام اعظم علی القاری
شرح مسند امام اعظم محمد بن حسن السنبھلی
مسند امام اعظم الحصکفی
تفسیر القرآن ابن ابی حاتم
الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم
الاصابہ فی تمیز الصحابہ ابن حجر عسقلانی
الایثار لمعرفۃ رواۃ الاثار ابن حجر عسقلانی
تقریب التھذیب ابن حجر عسقلانی
الدرر الکامنہ ابن حجر عسقلانی
الخیرات الحسان جلال الدین سیوطی
وفایات الاعیان ابن خلکان
معرفۃ علوم الحدیث ابن صلاحی
عقود اللآلی فی اسانید العوالی ابن عابدین
النخبۃ اللآلی شرح قصیدۃ بدء الامالی
متن قصیدۃ بدء الامالی

قصیدۃ نظامیہ
الانتقاء ابن عبدالبر
شذرات الذہب
لحظ الالحاظ
الفہرست ابن ندیم
کتاب الآثار امام یوسف
المناقب للمکی
مسند ابی حنیفۃ ابونعیم الاصفہانی متعدد نسخے
طبقات ابن سعد
رسالہ فی مناقب الطولونی
السنن لدار قطنی
التجرید الصریح
الانتصار والترجیح
ابجد العلوم
تسھیل التعرف
مرقات المفاتیح
ارشاد الساری قسطلانی
فتح الباری ابن حجر
تذکرۃ الموضوعات
ابن ماجہ اور علم حدیث عبدالرشید نعمانی
السہم المصیب
مسند اسحاق ابن رہویہ
کرامات اولیاء اللہ
کتاب الفتن لمروزی
رؤیۃ اللہ دار قطنی
ذم التاویل
حلیۃ الاولیا ابونعیم الاصفہانی
جزء ان للہ تسع تسعین اسما
شرح عقائد النسفی

جامع بیان العلم واہلہ ابن عبدالبر
تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ
تذکرۃ الحفاظ
العواصم من القاصم
کتاب الآثار محمد بن حسن
عقود الجمان
المناقب للکردری
تاریخ بغداد
العقد الثمین
کوثر النبی
مناقب ابی حنیفۃ وصاحبیہ
الجمع الصحیح
تبیض الصحیفۃ
اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ
الجواہر المضیہ
احکام القرآن لقرطبی
عمدۃ القاری عینی
تانیب الخطیب کوثری
مجمع البحار
التعلیق التقویم علی مقدمۃ کتاب التعلیم عبدالرشید نعمانی
مشکوٰۃ المصابیح
مسند ابی عوانہ
دلائل النبوۃ
شعب الایمان
ذیل تذکرۃ الحفاظۃ
خلق افعال العباد لبخاری
حسن الظن باللہ
النبراس شرح عقائد
المتون المعتبرۃ رشید احمد العلوی

مجموعۃ الفقہ الاکبر رشید احمد العلوی
القول الفصل شرح الفقہ الاکبر
شرح الفقہ الاکبر لقاضی قاضی عبید اللہ
تفسیر ابن کثیر
اثبات صفۃ العلو المقدسی
الزہد الشیبانی
الزہد احمد ابن حنبل
القناعۃ العرش وماروی فیہ
الرضاء عن قضاء اللہ
الایمان ابن اسحاق
الاعتقاد والھدایہ
الشرح المیسر عبد الرحمن الخمیس
شرح الفقہ الاکبر لسمرقندی
التوحید لمندہ
الفقہ الابسط ابوحنیفہ نعمان بن ثابت
شرح اعتقاد اہل السنۃ
الابانہ ابوالحسن اشعری
اصول الدین عبد القادر
الملل والنحل ابن حزن
متن السنوسیہ
متن الخریدۃ
متن الشیبانیہ
العقیدۃ الحسنۃ شاہ ولی اللہ دہلوی
درر الناصحین
النعمان
اسلامی دستور
امام اعظم ابوحنیفہ

شرح الفقہ الاکبر ملا علی قاری
شرح الفقہ الاکبر میس عبد الرحمن
جزء البطاقۃ
اثبات عذاب القبر
اثبات صفۃ العلو الجوینی
الزہد والرقاء ابن مبارک
مسند ابن مبارک
جزء العرش
الحجۃ علی اہل المدینۃ محمد بن حسن الشیبانی
الام محمد بن ادریس الشافعی
شرح الفقہ الاکبر محمد حسینی
ابوالمنتہی شرح الفقہ الاکبر
شرح الفقہ الاکبر رحمیۃ
العالم والمتعلم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت
معارج القبول
نظم الدرر شرح الفقہ الاکبر
اصول الدین لبزدوی
مقالات الاسلامین ابوالحسن اشعری
عقیدہ اہل المعالی
متن الجوہرۃ
متن النسفیہ
متن الباجوریہ
مقالات کوثری
الفوائد البھیۃ
حیاۃ ابی حنیفۃ
حیات امام اعظم

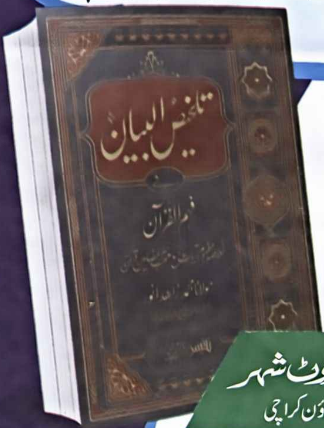


جمعیۃ پبلیکیشنز

ISBN: 978-969-8793-78-4

مضامین قرآن ایک ایسا وسیع ترین معلوماتی بحرِ بیکراں ہے جس تک کُلّی درجہ کی رسائی کسی کی ہوسکی ہے نہ ہوسکے گی۔ صاحب فکر و ذوق اہل علم نے اپنے اپنے دور میں مخصوص علمی دائرے میں رہتے ہوئے جزوی طور پر اس کی ترجیحی و منتخب ترتیب قائم کرنے کی کاوش کی ہے۔ یاد رہے قدیمی اصطلاحات کی جگہ جدید علمی اصطلاحات معرض وجود میں آچکی ہیں ہمارا اسامنا افکارِ باطلہ (عقائد فاسدہ) کے ساتھ باطل نظاموں سے بھی ہے۔ ان سے آگہی اور اسلامی نظام برحق کی ہمہ جہتی برتری کا علمی شعور ہماری اہم ترین ضرورت ہے (اور رہے گی)۔ ''تلخیص البیان'' میں عصری تقاضوں کی اہم ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے منتخب مضامین قرآن کی اہم ترجیحی فہرست (450 مضامین قرآن) کی نشاندہی سمیت 112 تشریحی عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ جسمیں عصرِ حاضر کے افکار باطلہ اور ذہنی خلجانات کو دور کرنے کی اہم کاوش نیز اسلامی نظام کے اہم ترین عنوانات کو وقت کے اہم علمی تقاضے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے مرعوب ہونے کی بجائے مضامین قرآن کی روشنی میں امتِ مسلمہ کی رہنمائی ہمارا دینی فریضہ ہے۔

اپنے علمی اثاثے کی حفاظت اور مطالعہ ہمارے لئے ازحد ضروری ہے۔



تلخیصُ البیان فی فہمِ القرآن

مؤلف
مولانا محمد زاہد انور
مہتمم جامعہ عثمانیہ شورکوٹ شہر
فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

- امام الاولیاء وشیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہٗ کا مکمل ترجمہ قرآن عزیز اس کا جزو خاص ہے۔
- وقت کے اہم تقاضوں پر چشم کشا حقائق کی نشاندہی کرتا فکر آمیز مقدمہ۔
- آیات نمبر کے مطابق خلاصہ مفہوم آیات کا نیا اسلوب (مختصر ترین الفاظ میں مفہوم کلامِ الٰہی کو بیان کرنے کی اہم کاوش)۔
- آخر میں چند اہم نوعیت کے علمی مضامین جن میں تحقیق محمود از افاداتِ محمودؒ، امام الحکمۃ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا فہم دین کے حوالے سے خصوصی نقطۂ نظر اور فکر محمودؒ، بالخصوص خلاصہ مضامین قرآن جیسے اہم عنوانات شامل ہیں۔
- ہر علمی لائبریری کی ضرورت نیز مدارس کے مدرسین، علماء وطلباء (مع عالمات وطالبات)، خطباء اور مساجد میں درس قرآن دینے والے حضرات سمیت جملہ اہل علم کیلئے وقیع علمی ومعلوماتی خزانہ۔
- عصر حاضر کے اکابر وعلماء کا پسند فرمودہ۔

جدید علوم پر دسترس کے دعوے داروں کا خیال ہے کہ حاملینِ علوم دینیہ کو عصرِ حاضر کے چیلنجز کا ادراک نہیں، ہمارا اصرار ہے کہ قرآن وسنت میں ہمہ جہتی چیلنجز (اعتقادی، معاشی، معاشرتی نیز اخلاقیاتی امراض) کا کامیاب عملی علاج تجویز کیا گیا ہے جملہ ادیانِ باطلہ (نظامِ ہائے باطلہ) کے مقابلے میں صداقتِ قرآن (حق) کے ابدی چیلنج کو ہر دور میں دوہرانے کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن مقدس کو عالمی آئین الٰہی کے طور پر سمجھنے نیز منتخب مضامین قرآن اور مختصر خلاصہ مفہوم آیات کے مطالعہ کیلئے ''تلخیص البیان فی فہم القرآن'' بفضلہ تعالیٰ اہم دینی وعصری حقائق کے حوالے سے (جدید اسلوب میں) بہترین علمی تحفہ ہے، ایک بار ضرور مطالعہ کیجئے!

انتہائی دلکش طباعت اور عمدہ کاغذ کے ساتھ مناسب قیمت پر۔

نیا ایڈیشن نئی ترتیب وتصحیح کے ساتھ (اضافہ شدہ)
دو جلدوں میں دستیاب

پرنٹنگ پوائنٹ المدینۃ 0334-6312463

نفیس قرآن کمپنی
5 لوئر مال بیسمنٹ مکہ سنٹر اردو بازار لاہور
0321-9464017
042-37361460

جامعہ عثمانیہ شورکوٹ سٹی
0333-6176051
0332-7236793

(مدارس کے علماء وطلباء مع عالمات وفاضلات کے لئے تاجرانہ قیمت پر رعائتی دستیابی)

منتخب 112 استنباطی مضامین قرآن (بحوالہ آیات، سورۃ)

میں سے چند اہم عنوانات کی جھلکیاں

اسلام کا نظامِ اعتقادات ☆ اسلام کا نظامِ عبادات ☆ اسلام کا نظامِ نظافت ☆ اسلام میں سنت رسول اللہ ﷺ کی تشریعی حیثیت وعظمت ☆ اسلام میں نظریہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حقیقت آمیز تجزیہ ☆ اسلام کا نظامِ امن ☆ قرآنی حقائق کا تاریخ سے موازنہ چہ معنی دارد؟ ☆ اسلام، عقل اور سائنس ☆ اسلام میں نظریہ رؤیتِ ہلال اور سائنسی استدلالات ☆ وحی رسالت اور وحی بمعنی الہام والقاء کے متعلق شرعی حقیقت ☆ اسلام کا نظامِ محنت ☆ اسلام کا نظامِ معیشت اور طبقاتی نظام (موازنہ) ☆ نظریاتی وتہذیبی اختلاف کے فکری نتائج ☆ اسلام میں حقوق نسواں ☆ عالمی معاشی وباء (سودی نظام) ☆ معاملات کے لین دین کا قانونی نظام ☆ بین المذاہب مکالمہ ☆ فرقہ واریت کی اُصولی بحث ☆ اسلام کا نظامِ عفت وپاکدامنی ☆ اسلام کا نظامِ میراث ☆ اسلام کا نظامِ تجارت اور اس کے رہنما اُصول ☆ احکام دین کا عملی وقانونی نفاذ ☆ عزیمت اور رخصت کا حکیمانہ اُسلوب ☆ وکالتِ باطلہ وصحیحہ ☆ اسلام میں نظامِ عدل وانصاف مع نظامِ شہادت ☆ حلال وحرام اور نظریہ شریعت ☆ مشروط امن معاہدے اور اسلام کی دفاعی وخارجہ پالیسی ☆ فلسفہ انقلابِ احوال ☆ جامعیت قرآن کی ہمہ جہتی حقیقت ☆ حکمت اور موعظہ حسنہ ☆ اسلام کا اخلاقی نظام ☆ اسلام کا نظامِ حکومت ☆ اختلاف رائے او رآزادی رائے ☆ نظریہ جہاد اور اس کی حکمت مع حدود وقیود ☆ عورت کی حکمرانی کے خلاف پہلی احتجاجی آواز ☆ قواعد واُصول وقتی نہیں ہوتے ☆ اسلام اور تربیت اولاد ☆ اسلام اور نظریہ تعلیم وفن ☆ ناموس رسالت ،آداب، محبّت وعشق رسول ﷺ ☆ اسلام کا نظامِ طلاق ☆ اسلام اور سماجی خدمات ☆ اسلام اور حقوق العباد ☆ بیعت ،تزکیہ نفس اور اصلاحی حقائق ☆ شریعت وطریقت ☆ کونسی جماعت برحق ہے؟ ☆ آدابِ معاشرہ کے اخلاقیاتی پہلو ☆ تحقیقِ حالات کا شرعی نظام ☆ تقلیدِ محمود کی آسان فہم حقیقت ☆ اسلام اور باقی مذاہب کا تقابلی جائزہ ☆ باطنی اعتبار سے عذابِ الٰہی کی بدترین قسم ☆ نظامِ حدود وتعزیرات ☆ نظامِ فطرت کے خدائی اُصول اور عقلیات کے بے لگام گھوڑے ☆ بحروبر میں سبب فساد کا تجزیہ برحق ☆ فلسفہ عزت وذلت وغیرہ